بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرف آغاز

ہمارے ملک ہندوستان کے اکثریتی طبقے کے ذہن ومزاج میں ایک عجیب وغریب رجحان پرورش پا رہا ہے، یہ طبقہ ملک کی سرزمین، اس کے وسائل، نظم ونسق اور نظام حکومت پر اپنی اجارہ داری تصور کرتا ہے، اور ایک مخصوص فکر اور نظریہ کے ماننے والوں کے علاوہ تمام لوگوں کو کسی بھی قسم کی شرکت اور حصہ داری سے محروم کر دینا چاہتا ہے۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، تو اس فکر اور نظریے کے حامل افراد کے دلوں میں ان کا وجود کانٹے کی طرح چبھتا ہے، ان کی خواہش ہے کہ اس ملک میں مسلمانوں کو جینے کے حق سے محروم کر دیا جائے، آزاد شہری کے بنیادی حقوق ان سے سلب کر لیے جائیں، یہاں کے معاشی، سیاسی، تعلیمی اور دیگر وسائل پر یا تو ان کا تصرف ہی نہ رہ جائے، یا اگر ہو بھی تو وہ اپنے تصرف میں آزاد نہ رہیں، مسلمانوں کی تعداد کے پیش نظر ملک سے ان کا وجود ختم کرنا تو آسان نہیں ہے، اس لیے اس مخصوص ذہنیت کے افراد ایسا نسخہ آزمانا چاہتے ہیں کہ مسلمان پست ہمتی، مایوسی، ناامیدی اور بے بسی جیسے مہلک امراض میں مبتلا ہو کر ذلت وپستی کے دلدل میں دھنستے چلے جائیں، جس سے ان کے لیے نکلنا مشکل ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ملک کی باگ ڈور کے ساتھ ساتھ متعدد ریاستوں کی حکومت ان انتہا پسند افراد کے ہاتھوں میں جب سے آئی ہے، مسلمانوں کو، ان کے دین ومذہب کو، ان کے ملی تشخص کو، ان کی مذہبی تعلیم اور احکام شریعت کو مختلف طریقوں سے نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ تین طلاق، تعدد ازواج، نکاح کا رجسٹریشن، علی گڈھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ کے اقلیتی کردار، بابری مسجد قضیہ سے لے کر ہجوم کے ذریعے مسلمانوں پر حملے اور گوشت بندی جیسے مسائل تک سب اسی سازش کے تانے بانے ہیں کہ اسلام کا نام لینے والوں پر کس طرح عرصۂ حیات تنگ کر دیا جائے کہ وہ آزادی کے ساتھ مذہبی امور کی ادائیگی وانجام دہی اور من حیث القوم اپنی ترقی کے بارے

میں سوچ بھی نہ سکیں، جو امید ہے کہ محض خواب وخیال ہی رہے گا اور کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوگا، لیکن اس سے بھی انکار نہیں کہ وقتی طور پر تو مسلمانوں کو مسائل ومشکلات سے دوچار ہونا پڑے گا اور ایسا ہو بھی رہا ہے، جس کا مقابلہ کرنے کے لیے نہایت ہوش وحواس، سمجھ بوجھ اور دور اندیشی سے کام لینے کی ضرورت ہے۔

ہمارے ملک کے اکثریتی افراد کے ذہنوں کو تعصب اور فرقہ پرستی کے زہر سے مسموم کرنے اور انتہا پسندی کے سانچے میں ڈھالنے کی ملک کی آزادی کے بعد سے ہی مسلسل کوشش کی جاتی رہی ہے، جو اب بہت حد تک کامیابی سے ہم کنار ہو چکی ہے، لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ پورا اکثریتی طبقہ اس سانچے میں ڈھل چکا ہو، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ صرف مٹھی بھر افراد ہیں جنھوں نے پورے ملک میں اودھم مچا رکھی ہے، اکثریت آج بھی یہاں کے سیکولر کردار، جمہوری اقدار وروایات اور اس سرزمین پر بسنے والی مختلف قوموں کی یکجہتی اور آپس کے اتحاد اور اس کی قوت پر یقین رکھتی ہے، اور وہ یہ بخوبی سمجھتی ہے کہ اسی میں ملک کی ترقی، اس کا استحکام اور اس کی سلامتی کا راز مضمر ہے، آپسی محبت اور بھائی چارے کو فروغ دے کر ہی ملک کو تعمیر وترقی کی شاہراہ پر گامزن رکھا جاسکتا ہے۔ نفرت وعداوت کی سیاست سے جو نقصان ہوگا وہ کسی ایک طبقے یا فرقے کا نہیں ہوگا، بلکہ پورے ملک کا نقصان ہوگا، یہ ایک بالکل عام فہم اور سیدھی سی بات ہے، لیکن تعجب ہے کہ کچھ سیاست داں اس کو یا تو سمجھتے نہیں ہیں، یا سمجھ کر محض اپنے اقتدار اور سیاسی فائدے کے لیے اس کو نظر انداز کرتے ہیں۔

جہاں تک مسلمانوں کی حب الوطنی کا سوال ہے تو ان کو اس کے لیے کسی قسم کا ثبوت پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے، تاریخ کے اوراق پلٹیں گے تو معلوم ہوگا کہ ملک کے تحفظ کے لیے وہ صف اول میں رہے ہیں، اگر کبھی دشمنوں سے مقابلہ ہوا ہے تو جان کی بازی لگا کر سرحدوں کی حفاظت کی ہے، اس ملک کے چپے چپے کی انھوں نے اپنے لہو سے آبیاری کی ہے، اس چمن میں کھلنے والے پھولوں کے رنگوں میں ان کے خون کی رنگت اور ان کی خوشبوؤں میں ان کے خون کی خوشبو ملے گی، دیدۂ کور کو نظر آئے یا نہ آئے مگر پورا چمنستان وطن ان کے ایثار وقربانی سے لالہ زار ہے:

اٹھائے کچھ ورق لالہ نے، کچھ نرگس نے، کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

اڑالی قمریوں نے، طوطیوں نے، عندلیبوں نے

چمن والوں نے مل کرلوٹ لی طرز فغان میری

بہر حال یہ حقیقت ہے کہ مسلمان اس وقت من حیث القوم بہت سخت آزمائش سے دو چار ہیں، اس لیے ان کو بہت ہوش وحواس اور سمجھ داری و بردباری سے کام لینے کی ضرورت ہے، خواب غفلت سے بیدار ہوکر وقت اور حالات کے تقاضوں پر نظر رکھنی چاہیے، اسلام کی تعلیمات کو اپنے لیے مشعل راہ سمجھنا چاہیے، تعلیمی اور اقتصادی ومعاشی ترقی اور اسلام کا آئیڈیل اوراس کی سچی اور عملی تصویر بن کراس کے اندر انسانیت نوازی، محبت و بھائی چارگی صلح وآشتی، اور ہمدردی ورواداری کا جو درس دیا گیا ہے، اس کو عام کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ موجودہ حالات میں پورے ملک میں مسلمانوں کو غصہ واشتعال دلانے کی جو کوشش کی جارہی ہے، اس سے بچ بچا کر قدم آگے بڑھانے کی سخت ضرورت ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

☆☆☆☆☆

☆☆☆

صفحہ ۴۰ کا بقیہ

ترکہ تقسیم ہونے سے پہلے مال مشترک ہے اور مال مشترک میں سے کسی کو بھی خرچ کرنا جائز نہیں ہے، **ولایجوز لاحدھما أن یتصرف فی نصیب الآخر الا بامرہ وکل واحد منھما کالاجنبی فی نصیب صاحبہ** (عالمگیری ج ۲ ص ۳۰۱) اس لیے ہم سب پر لازم اور ضروری ہے کہ مورث کے انتقال کے بعد جلد از جلد میراث تقسیم کریں اور ہر وارث کا حصہ پورا پورا ادا کریں۔ اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ ہم سب مسلمانوں کو دین پر مکمل عمل کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔ واللہ اعلم بالصواب۔

ماخوذ: از تفسیر عزیزی (مسلسل)

مقدمہ سورۃ البروج

سورۂ بروج مکی ہے، اس میں بائیس (۲۲) آیات، ایک سو نو (۱۰۹) کلمات اور چار سو تیس (۴۳۰) حروف ہیں۔

سورۂ انشقاق کے ساتھ ربط کی وجوہ

(۱) سورۂ انشقاق کے ساتھ اس کا ربط یہ ہے کہ سورۂ انشقاق کے شروع میں آسمان کے پھٹنے کا ذکر ہے اور اس سورت میں دنیا میں آسمان کے بارہ برابر حصوں کا ذکر ہے، ان میں کا ہر حصہ اپنا جُدا حکم و تاثیر رکھتا ہے۔

(۲) پھر اُس سورت کے آخر میں تھا ''بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُكَذِّبُوْنَ o وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُوْعُوْنَ'' یہی مضمون اس سورت میں اس طرح آیا ہے ''بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ تَكْذِيْبٍ o وَاللّٰهُ مِنْ وَّرَآئِهِمْ مُّحِيْطٌ''

(۳) اسی طرح اُس سورت میں اہل جنت اور اہلِ جہنم کا تذکرہ تھا، سو وہ تذکرہ یہاں بھی ہے، لہٰذا دونوں سورتوں میں کمال مناسبت پیدا ہوگئی۔

شانِ نزول

اس سورت کا شانِ نزول یہ ہے کہ ہجرت سے پہلے مکہ کے اندر کفار مسلمانوں کو ستاتے اور طرح طرح کی اذیتیں دیتے تھے، مسلمانوں نے اپنی دردناک حالت کا ذکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تو آپ ﷺ نے مسلمانوں کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ گھبراؤ نہیں، وہ وقت آنے والا ہے جب اللہ تعالیٰ تم کو ان کفار سے بدلہ لینے کی طاقت عطا فرمائے گا، پھر اس وقت یہ لوگ تمہارے سامنے ایسے ہوں گے جس طرح آج تم ہو، مشرکینِ مکہ نے جب یہ بات سنی تو انھوں نے تمسخر اڑایا، ٹھٹھہ مذاق کرنے لگے کہ بھلا یہ مفلس و ذلیل بھی کبھی ہم سے بدلہ لینے کی طاقت حاصل کرسکیں گے، ہم اگر اللہ کے نزدیک عزت والے نہ ہوتے تو ہم کو ان پر اللہ غالب کیوں کرتا، سو ہمارے نصیب میں ہی عزت

وسرفرازی اور غلبہ وقوت ہے، اور ان کے نصیب میں دائمی ذلت وخواری ہے۔

مشرکین کے جواب میں یہ سورت نازل ہوئی اور اس کے شروع میں آسمان کی قسم یوں کھائی کہ وہ آسمان جو بروج والا ہے، ہر برج دراصل اس جہان اور جہان والوں کے لیے تبدیلیوں اور انقلابات کا سبب ہے، بہت سی چیزیں ایک بُرج کی تاثیر سے عزت والی ہوتی ہیں، وہی چیز دوسرے بُرج کی تاثیر سے ذلیل وبے قدر ہوجاتی ہے، جیسے گرم لباس وپوشاک گرمیوں میں اور ٹھنڈا پانی اور برف جاڑوں میں ذلیل وبے قدر ہوجاتا ہے، اشارہ اس طرف کرنا ہے کہ ہر سال موسموں کا انقلاب ان کے سامنے رونما ہوتا ہے، آج ایک موسم کے لحاظ سے ایک چیز قدر وقیمت والی ہے، کل وہی چیز دوسرے موسم میں بے قدر وقیمت ہوجائے گی، سو یہاں دوام کسی بات کو نہیں، اس لیے اپنی وقتی عزت وغلبہ پر انہیں مغرور نہ ہونا چاہئے اور نہ ہی مسلمانوں کا تمسخر اڑائیں، اس انقلاب کو ذہن میں رکھیں اور عبرت پکڑیں۔

وجہ تسمیہ

یہاں سے معلوم ہوا کہ اس سورت کا نام سورۃ البروج اسی مناسبت سے رکھا گیا ہے، اور بتلانا یہ ہے کہ نیکی اور بدی ایک دوسرے کے تعاقب میں ہیں اور سعادت ونحوست کے ایام بدلتے رہتے ہیں، تاکہ یہ معلوم ہوجائے کہ آج جو لوگ مسلمانوں کو ایذا پہنچاتے ہیں اور غلبہ وقوت رکھتے ہیں ممکن ہے ان کے یہ دن بدل جائیں اور انتقام میں پکڑے جائیں۔

اور نیک بختی اور بدبختی کے اسباب میں سے عوام کے نزدیک مشہور اسباب آسمان کے بارہ بُرج ہیں کہ ہر سال وہ ان کا مشاہدہ کرتے اور دیکھتے ہیں۔ (یعنی زمین کی سورج کے گرد سالانہ گردش کے نتیجے میں سورج آسمان کے اندر اس طرح حرکت کرتا ہوا نظر آتا ہے کہ ہر مہینہ میں وہ ایک مخصوص حصے کے اندر پہنچتا ہے اس طرح سال میں وہ بارہ حصوں کو مکمل کرتا ہے، یہی بارے حصے بارہ بُرج کہلاتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ کے مطابق سورج کی اسی گردش کے نتیجے میں دنیا پر موسموں کی تبدیلی اور دیگر انقلابات رونما ہوتے ہیں، اور یہ تبدیلیاں اور انقلابات کسی کے حق میں فائدے کا ذریعہ ہوتے ہیں اور کسی کے حق میں نقصان کا ذریعہ، اسی لیے ان بُروج کو عام طور پر نیک بختی اور بدبختی کا سبب سمجھا جاتا ہے) اسی لیے قمری مہینوں کو خوش نصیبی یا بدنصیبی کے بارے میں معتبر نہیں سمجھا گیا کہ ان کے بدلنے سے زمین میں کوئی تغیر وانقلاب رونما نہیں ہوتا، بلکہ وہ خود بُرجوں کے انقلاب کو قبول کرتے ہیں اور ہر موسم میں آتے ہیں۔

تفسیر سورۃ البروج

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ○

قسم ہے آسمان کی جس میں بُرج ہیں

ہر بُرج اچھائی، برائی، اور سعادت ونحوست (کی تاثیر میں ظاہری اعتبار سے) الگ حکم رکھتا ہے، اور ہر بُرج اپنی الگ تاثیر رکھنے کے باوجود (سورج کے چکر کی وجہ سے) بار بار لوٹ کر آتا ہے۔ کچھ عرصہ تک وہ اپنی تاثیر دکھاتا ہے، پھر اس کی جگہ دوسرا برج ظاہر ہوجاتا ہے اور پہلے والا زائل ہوجاتا ہے، یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہتا ہے، (جس طرح ان برجوں میں سے کسی ایک ہی برج کی تاثیر ہمیشہ نہیں رہتی، بلکہ اس میں تغیر ہوتا رہتا ہے اسی طرح) کسی شخص کو اس گھمنڈ میں نہیں رہنا چاہئے کہ اس کی اچھی حالت اسی کے ساتھ خاص ہے کسی دوسرے کو میسر نہیں آئے گی، اس لیے کہ ہوسکتا ہے اس کی موجودہ حالت ختم ہوجائے اور اس کی بجائے بری حالت میں مبتلا ہوجائے (جیسا بروج میں تغیر ہوتا ہے)

بارہ بروج کی حقیقت:

بُرجوں کی حقیقت یہ ہے کہ سورج کی گردش آسمان (خلاء) میں جس انداز سے ہوتی ہے اس سے (فضائے بسیط) میں ایک (فرضی بیضوی شکل کا) دائرہ بنتا ہے جس کو دائرۃ البروج کہتے ہیں، سورج اس دائرے کو ایک سال کے عرصے میں مکمل طے کرتا ہے، اس دائرے کو بارہ برابر حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے، اس طرح اس کے بارہ حصے بنتے ہیں ہر حصے کو برج کہا جاتا ہے۔[1]

اور ہندی، فارسی، عربی، یونانی اور فرنگی تمام ماہرینِ فلکیات اس دائرے کے بارہ حصے ہونے پر ہی متفق ہیں، اس سے کم یا زیادہ کا کوئی قائل نہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ اپنے دائرے میں سورج کی

---

(۱) جدید ماہرین فلکیات کی تحقیق یہ ہے کہ سورج زمین کے گرد نہیں گھومتا بلکہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے، چنانچہ علامہ شیخ محمد موسیٰ البازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: دائرۂ بروج او پر ستاروں اور فضائے بسیط میں اس راستے کو کہتے ہیں جس میں آفتاب سارا سال ہمارے ارد گرد گردش کرتے ہوئے نظر آتا ہے، اور یہ بات واضح ہے کہ آفتاب کی اس حرکت کا سبب درحقیقت زمین کی حرکت حول الشّمس ہے، پس زمین آفتاب کے ارد گرد دائرہ بروج میں متحرک رہتی ہے زمین کی اس حرکت کی وجہ سے ہمیں آفتاب زمین کے ارد گرد مشرق سے مغرب کی طرف دائرۂ بروج میں حرکت کرتا ہوا نظر آتا ہے، اس مناسبت سے منطقۃ البروج کو طریق الشّمس بھی کہتے ہیں، یہ دائرہ چونکہ بروج پر گذرتا ہے اس لیے اسے دائرۂ بروج بھی کہتے ہیں بلکہ بارہ بروج اسی دائرے کے بارہ مساوی ٹکڑوں کا نام ہے، ہر ٹکڑا ہر برج میں آفتاب تقریباً ایک ماہ رہتا ہے اور سال میں بارہ بروج طے کرلیتا ہے (سماء الفکریٰ شرح ہیئۃ الکبریٰ ص ۴۴)

گردش کے نتیجے میں زمین پر چار قسم کے موسم پیدا ہوتے ہیں، سردی، گرمی، بہار اور خزاں، یعنی سورج دائرۂ بروج میں گردش کرتے ہوئے جب ایک مخصوص حصے میں پہنچتا ہے تو زمین پر اس کی گرمی وحرارت پہنچنے کی مناسبت سے خاص موسم پیدا ہوتا ہے، اس طرح جب دوسرے حصے میں پہنچتا ہے تو دوسرا موسم اور اسی طرح تیسرا اور چوتھا، گویا اس اعتبار سے اس دائرے کے چار حصے فرض کر لیے گئے اور پھر چونکہ ایک موسم کے بعد دوسرا موسم دفعۃً نہیں آجاتا جیسے گرمی کے بعد فوراً سردی نہیں آجاتی، بلکہ ایک درمیانی عرصہ ایسا ہوتا ہے جو دونوں سے ملتا جلتا ہے، اس لیے ہر موسم کے تین حصے ہوئے، ابتداء، درمیان، اور انتہاء لہٰذا اب سورج کے گردشی دائرے کے چاروں حصوں میں سے ہر حصے کے اندر مزید فرضی تین حصے اور ہو گئے، اس طرح اس دائرے کے بارہ مساوی حصے ہوئے، اور ہر حصے کا نام برج رکھ لیا گیا۔

اور یہ وجہ بھی ہے کہ سورج کو اپنے سال کا دورہ پورا کرنے میں بارہ مرتبہ چاند کے ساتھ جمع ہونے اور ملنے کا اتفاق ہوتا ہے اور ہر بار چاند کا سورج کے ساتھ جمع ہونا آخر تک یہی قمری مہینہ ہوتا ہے تو سورج وچاند کے جمع ہونے کی تعداد کے اعتبار سے بھی آسمان (خلاء کے دائرۃ البروج) کے بارہ حصے مقرر کیے اور ہر حصے کا نام برُج رکھا[1]۔

(۱) یہ بات تو مسلم ہے کہ قمری ماہ چاند کے ایک مکمل چکر کا نام ہے، لیکن قمری ماہ کے مبداء ومنتہیٰ اور بعض دیگر عوامل کی وجہ سے ماہرین نے قمری ماہ کی تین قسمیں ذکر کیں ہیں، قسمِ اول شرعی ماہ، اس کی مدت ایک ہلال سے دوسرے ہلال تک ہے، شرعی ماہ ۲۹ دن سے کم اور ۳۰ دن سے زیادہ نہیں ہوتا۔

قمری ماہ کی دوسری قسم شہرِ (ماہ) فلکی ہے، اسے شہرِ نجمی بھی کہتے ہیں، اس قسم کا مبنیٰ ومدار چاند کا حقیقی کامل دورہ ہے، دیگر عوارض مثلاً حرکتِ ارض حول الشمس، رؤیت ہلال سے قطع نظر چاند کی ایک گردش حول الارض شہرِ فلکی ونجمی کہلاتی ہے، وجہ تسمیہ بالفلکی والنجمی یہ ہے کہ یہ ماہ فلک یعنی بالا خلاء بسیط کے نجومِ ثوابت میں سے کسی ایک نجم سے اس تک دوبارہ عودِ قمری کی مدت کا نام ہے۔

قمری ماہ کی تیسری قسم شہر اقترانی سے موسوم ہے۔ اقتران، قران اور اجتماع تینوں مترادف الفاظ ہیں، مطلب یہ ہے کہ قمری ماہ کے آخر میں چاند وسورج کے مابین اجتماع ہوتا ہے، چاند کا زمین وسورج کے درمیان آنا اس طرح کہ زمینی شخص کی آنکھ سے وہمی نکلا ہوا خط پہلے چاند پر اور پھر سورج پر گذرے اقتران واجتماع کہلاتا ہے اسی حالت کو محاق بھی کہتے ہیں، اسی وجہ سے اقترانی ماہ کی یہ تعریف درست ہے کہ وہ ایک اجتماع سے دوسرے اجتماع تک کے زمانہ کا نام ہے (سماء الفکریٰ ص ۴۰۴، ۴۰۵)

چاند کا نصف ہمیشہ کے لیے سورج کے سامنے ہوتا ہے اور دوسرا نصف پوشیدہ ہوتا ہے، زمین بھی اسی طرح ہے، ہمیشہ زمین کے تقریباً نصف حصہ پر دن ہوتا ہے اور بالمقابل نصف میں رات ہوتی ہے، پس چاند کا نصف سورج کے سامنے ہونے کی وجہ سے روشن ہوتا ہے اور دوسرا دائماً تاریک ہوتا ہے۔۔۔۔۔۔ محاق (اجتماع) قمری ماہ کے آخری ایک دو دنوں میں ہوتا ہے، حالتِ محاق میں چاند نظر نہیں آتا، محاق اس وقت متحقق ہوتا ہے جب کہ چاند اور آفتاب ایک برج میں مجتمع ہوں اصطلاح میں اجتماع شمس وقمر کا مطلب یہ ہے کہ چاند اور آفتاب تقریباً ایک سمت پر واقع ہوں، قمری ماہ کے آخری ایک دو دن میں شمس وقمر تقریباً اکٹھے حرکت کرتے ہوئے طلوع ہوتے ہیں اور اکٹھے غروب لہٰذا حالتِ اجتماع میں چاند کا تاریک نصف ہماری طرف اور روشن نصف آفتاب کی طرف ہوتا ہے، اس لیے چاند ہمیں مہینے کے آخری ایک دو دن نظر نہیں آتا اھ (سماء الفکریٰ ص ۴۱۱ تا ۴۱۲)

برجوں کے نام:

پھر رات کو انہی برجوں میں مختلف ستاروں کے جمع ہونے سے جو مخصوص شکلیں رونما ہوتی ہیں ان کی مناسبت سے برجوں کے حسب ذیل نام رکھے ہیں:

(۱)حمل	(۲)ثور	(۳)جوزا
(۴)سرطان	(۵)اسد	(۶)سنبلہ
(۷)میزان	(۸)عقرب	(۹)قوس
(۱۰)جدی	(۱۱)دلو	(۱۲)حوت

گھنٹہ، منٹ، سیکنڈ کی حقیقت:

اور فلکیات والوں نے آفتاب کی حرکت کے دنوں کے مطابق ان بُرجوں میں سے ہر برج کو تیس حصوں میں تقسیم کیا ہے اور ہر حصے کا نام درجہ رکھا ہے، پھر ہر درجے کو ساٹھ حصوں میں تقسیم کیا اور ہر حصے کا نام دقیقہ رکھا، جس کو ہندی میں گھڑی کہتے ہیں، پھر ہر دقیقہ کو ساٹھ حصوں میں تقسیم کیا اور ہر حصے کا نام ثانیہ رکھا جس کو ہندی میں پل کہتے ہیں، پھر ہر ثانیہ کو ساٹھ حصوں میں تقسیم کیا اور ہر حصے کا نام ثالثہ رکھا، جس کو ہندی میں چھن کہتے ہیں علی ہذاالقیاس۔

برجوں کے ناموں کی وجہ تسمیہ:

(۱) حمل:- بکری کا بچہ، چونکہ تیئیس (۲۳) ستاروں کے باہم ملنے سے بکری کے بچے کی سی صورت پیدا ہوگئی ہے جس کا سر مغرب کی طرف اور دُم مشرق کی طرف ہے، پانچ ستارے اور بھی اس کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں گو کہ وہ شکل سے باہر واقع ہیں۔

(۲) ثور:- بیل، بتیس (۳۲) ستاروں کے ملنے سے بیل کی صورت نمودار ہوگئی ہے، جس کا سر بجانب مشرق اور دُم بجانب مغرب ہے، اور بھی اس کے ساتھ ستارے ہیں جن کو عین الثور کہتے ہیں اور ثریا بھی جو انگور کے خوشہ کی طرح ہیں۔

(۳) جوزا:- (دو آدمی ملے ہوئے) اٹھارہ ستاروں کے ملنے سے ایسی صورت پیدا ہوگئی ہے گویا دو آدمی ملے ہوئے ہیں کہ ان کے سر شمال مشرق کی طرف ہیں اور پاؤں جنوب مغرب کی

طرف۔

(۴) سرطان:-(کیکڑا) نوستاروں کے ملنے سے یہ صورت بن گئی ہے۔

(۵) اسد:- (شیر) ستائیس ستاروں کے ملنے سے یہ صورت پیدا ہوگئی ہے، اور زہرہ ستارہ بھی اس سے تعلق رکھتا ہے۔

(۶) سنبلہ:- (خوشہ) یہ ایک عورت کے ہاتھ میں معلوم ہوتا ہے جس کا سر اس کی دم کی طرف اور پاؤں میزان کی طرف ہیں، اور اس کے ہاتھ کے پاس کہ جس میں خوشہ معلوم ہوتا ہے ایک ستارہ ہے جس کو سماک اعزل کہتے ہیں، یہ شکل چھبیس ستاروں سے بنی ہے۔

(۷) میزان:- یہ ترازو کی صورت ہے جو آٹھ ستاروں سے مرکب ہے۔

(۸) عقرب:- (بچھو) یہ شکل اکیس ستاروں سے بنی ہے۔

(۹) قوس:- (کمان) یہ ایسی شکل ہے کہ ایک شخص کے ہاتھ میں کمان ہے جس میں تیر لگا ہوا ہے، یہ اکتیس ستاروں سے مرکب ہے۔

(۱۰) جدی:- (بھیڑ کا چھوٹا بچہ) یہ اٹھائیس ستاروں سے بنی ہوئی شکل ہے، سعد ذابح ستارہ اسی سے متعلق ہے۔

(۱۱) دلو:- (ڈول) ایک مرد کے ہاتھ میں ایک ڈول سا معلوم ہوتا ہے یہ بیالیس ستاروں سے مرکب ہے۔

(۱۲) حوت:- (مچھلی) یہ دو مچھلیاں باہم ملی ہوئی معلوم ہوتی ہیں ایک کا منھ دوسرے کی دم کی طرف ہے یہ چوبیس ستاروں سے مرکب ہے۔

برجوں کے احکام وخواص کا اختلاف:

برجوں کی اشکال کے اختلاف کے علاوہ ان کے احکام وخواص میں بھی اختلاف ہے، جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) برجِ حمل:- حمل مریخ کا گھر، زہرہ کا وبال اور آفتاب کا شرف ہے، جب وہ اس کے اندر انیسویں درجہ پر ہو اور زحل کے لیے ہبوط ہے اور حمل کو بُرج مذکر، نہاری، گرم خشک، صفراوی

اور برج منقلب ربیعی، شمالی کہتے ہیں [1]

(۲) برِج ثور:- یہ زہرہ کا گھر، مریخ کا وبال اور قمر جب اس کے تیسرے درجے میں تو اس کے لیے شرف ہے، یہ مؤنث، لیلی، سرد خشک، سوداوی اور ثابت ہے۔

(۳) برِج جوزاء:- یہ عطارد کا گھر، مشتری کا وبال، رأس کا شرف اور ذنب کا ہبوط ہے، اس کو مذکر، نہاری، گرم وتر، دموی اور ذوجسمین شمار کرتے ہیں (ذوجسمین وہ بُرج ہوتا ہے جس میں سورج کو اعتدال ہوتا ہے)

(۴) برِج سرطان:- یہ قمر کا گھر، زحل کا وبال، مشتری کا شرف اور مریخ کا ہبوط ہے، اس کو مؤنث، لیلی، اور برِج منقلب شمار کرتے ہیں۔

(۵) برِج اسد:- یہ سورج کا گھر، زحل کا وبال، اور ثابت ہے، اس میں شرف وہبوط نہیں، اس کو مذکر، نہاری، گرم وخشک اور صفراوی شمار کرتے ہیں۔

(۶) برِج سنبلہ:- یہ عطارد کا گھر، اسی کا شرف بھی ہے، اور مشتری کا وبال ہے، زہرہ اور ذوجدین کا وبال ہے، اور اس کو مؤنث، لیلی، سرد وخشک، سوداوی کہتے ہیں۔

(۷) برِج میزان:- یہ زہرہ کا گھر، مریخ کا وبال، زحل کا شرف، آفتاب کا ہبوط اور برِج منقلب ہے، اسے مذکر نہاری گرم وتر اور دموی قرار دیتے ہیں۔

(۸) برِج عقرب:- یہ مریخ کا گھر، زہرہ کا وبال، قمر کا ہبوط اور برِج ثابت ہے اس کو

---

(۱) نجوم، فلکیات وہیئت کے فن میں بروج وسیارات کے مختلف حالات کے اعتبار سے مختلف فنی اصطلاحات مقرر کی گئی ہیں، مثلاً بعض بروج کو بعض سیارات کا گھر قرار دیتے ہیں، جیسے مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ بُرج حمل مریخ کا گھر ہے اسی طرح ہر بُرج کے درجات مقرر کیے ہیں جیسے مصنف رحمۃ اللہ علیہ پیچھے ذکر فرما چکے ہیں پھر ان درجات کی سیاروں کے لحاظ سے کچھ خاصیات ہیں، جیسے مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا آفتاب جب حمل کے انیسویں درجے میں ہو تو اس کے لیے شرف ہے اور زحل کے لیے ہبوط (پستی، گراوٹ) اسی طرح نجوم کے ماہرین نے ہر بُرج کی طبیعت، مزاج، جنس اور ماہیت بھی مقرر کی ہے، بعض کی طبیعت ومزاج گرم خشک اور بعض کی سرد تر ہے، بعض کی جنس مذکر ہے اور بعض کی مؤنث، بعض کی ماہیت منقلب ہے اور بعض کی کچھ اور، مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے برج حمل کی جنس مذکر، طبیعت گرم خشک صفراوی، اور ماہیت منقلب ربیعی شمالی بیان فرمائی ہے، منقلب وہ بروج ہوتے ہیں جن میں سورج کو انقلاب آتا ہے، یعنی سورج کی حرکت میں دائرۃ البروج کے اندر تبدیلی واقع ہوتی ہے، کہ وہ ایک برج سے نکل کر دوسرے میں داخل ہوتا ہوا نظر آتا ہے، اس انقلاب کے نتیجے میں موسم کی تبدیلی ہوتی ہے چنانچہ سورج کا یہ انقلاب سال میں چار مرتبہ ہوتا ہے اسی لیے چار موسم رونما ہوتے ہیں، اور بعض بروج کو ثابت کہا جاتا ہے کہ ان میں سورج رُکا ہوا معلوم ہوتا ہے، پھر چھ بروج شمالی ہیں اور چھ جنوبی، برج شمالی ربیعی ہے یعنی معدل النہار کے خط سے جانب شمال میں واقع ہے۔ ۱۲، سفیر احمد

مؤنث، سردوتر اور بلغمی قرار دیتے ہیں۔

(۹) برجِ قوس:- یہ مشتری کا گھر، عطارد کا وبال، رأس وذوجدین کا ہبوط اور ذنب کا شرف ہے، اسے مذکر، نہاری گرم وخشک اور صفراوی کہتے ہیں۔

(۱۰) برجِ جدی:- یہ زحل کا گھر، قمر کا وبال، مریخ کا شرف مشتری کا ہبوط، اور برجِ منقلب مؤنث ہے۔

(۱۱) برجِ دلو:- یہ زحل کا گھر، آفتاب کا وبال، اس میں شرف وہبوط نہیں اور ثابت ہے، اس کو ہوائی، گرم وتر، مذکر اور نہاری شمار کرتے ہیں۔

(۱۲) برجِ حوت:- یہ مشتری کا گھر، عطارد کا وبال، اسی کا ہبوط اور زہرہ کا شرف ہے، اس کو مؤنث، لیلی، سردوتر، بلغمی اور ذوجدین شمار کرتے ہیں۔

خلاصۂ کلام:

حاصل کلام یہ ہے کہ ان بروج کے خواص جو عوام کے ذہن کی نسبت سے زیادہ واضح وروشن ہیں وہ موسموں کا ادلنا بدلنا ہے، کہ ان موسمی تبدیلیوں کے ضمن میں (معاش، صحت وبیماری کے حوالے سے اکثر ایسے حالات رونما ہوتے ہیں کہ) اس دنیا میں (لوگوں کے اندر) عزت وذلت کے حالات بدلتے رہتے ہیں، یہ انقلاب وتبدیلی ہر سال ہوتی رہتی ہے، پس یہ صریح دلیل ہے اس بات کی کہ حالات ہمیشہ ایک جیسے نہیں رہتے، عزت وذلت بدلتی رہتی ہے، اس سال عزت ہے ذلت مفقود ہے تو آئندہ سال اس کا عکس ہوسکتا ہے کہ ذلت آجائے عزت چلی جائے۔

یہ تو وہ انقلاب ہے جو خاص وعام کسی سے مخفی نہیں اس کے پہچاننے کے لیے نورِ نبوت کی مدد کی بھی ضرورت نہیں، لیکن اب ایک ایسے انقلاب کو بیان فرمارہے ہیں جو لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ، اور عقل کے بل بوتے پر جس تک رسائی ممکن نہیں جب تک کہ نورِ نبوت (نبوی علوم) کی مدد حاصل نہ ہو، چنانچہ فرماتے ہیں:

وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ○

اور اُس دن کی جس کا وعدہ ہے

فرمایا اس دن کی قسم کھاتا ہوں بدلہ دینے کے لیے جس کا وعدہ کیا گیا ہے، اس دن ایک بہت

بڑی تبدیلی اور انقلاب برپا ہوگا، یہ زمین، آسمان اور اس کے بروج سب الٹ پلٹ دیئے جائیں گے، ایک دوسرا عالم وجود میں آجائے گا، اس عالم میں یہاں کے عزت والوں کو (جو اللہ کے نافرمان ہیں) ذلت ورسوائی کا سامنا ہوگا، اور جنہیں یہاں ذلیل سمجھا جاتا ہے (اور وہ اللہ کے فرمانبردار ہیں) وہاں عزت سے سرفراز ہوں گے۔

جزا دینے کے لیے تین امور لازمی ہیں:

جب وہ دن جزا وبدلے کے لیے مقرر کیا گیا ہے، تو سمجھ لینا چاہئے کہ جزا کے عمل کو وجود میں لانے کے لیے تین چیزیں ضروری ہیں۔

(۱) جزا کا استحقاق۔

(۲) حاکم کا ہونا جو ہر ایک کو اس کے مناسب جزا دے۔

(۳) وہ کام جس پر جزا دی جارہی ہے اس کا ہونا جیسے نیکی، اور بدی۔

ان تین چیزوں کو بیان کرنے کے لیے دو مزید قسمیں کھائی ہیں چنانچہ فرمایا:

وَشَاهِدٍ وَّ مَشْهُوْدٍ○

اور اُس دن کی جو حاضر ہوتا ہے اور اُس کی کہ جس کے پاس حاضر ہوتے ہیں

اور (قسم ہے) اس دن کی جو حاضر ہوتا ہے اور اس کی جس کے پاس حاضر ہوتے ہیں۔ یعنی میں ہر حاضر ہونے والے کی قسم کھاتا ہوں جو اس دن حاضر ہوگا چاہے اس کا تعلق انسانوں کی جنس سے ہو یا جنوں سے یا فرشتوں سے کہ یہ سب اس دن ایک جگہ میں جمع ہوں گے، ایک مجمع عظیم ہوگا، کہ اس جیسے اجتماع کی مثل کا کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا، اس عظیم اجتماع کی بدولت جزا وبدلہ دینے کا معاملہ ٹھیک طریقے سے ظہور پذیر ہوگا، کہ مدعی، مدعیٰ علیہ، اور گواہ سارے افراد موجود ہوں گے۔

(جاری ہے)

الازہار المربوعہ

(مسلسل)

محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ

اس کے بعد فرماتے ہیں: ''غالباً نوادر کی روایت ہی کی وجہ سے حافظ ابن قیم کی اس عبارت سے یعنی ''یہ مذہب ابوحنیفہ میں، دو قولوں میں سے ایک قول ہے'' مفتی بنارسی نے بطور نتیجہ یہ لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہ سے ایک طلاق رجعی کی بھی ایک روایت ہے واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب اور اس اعتبار سے اغاثہ کا حوالہ دینا بھی بالکل صحیح ہے''

جواب:- مجیب کا یہ انداز کلام صاف بتا رہا ہے کہ ان کو بھی اپنی جگہ پر یقین ہے کہ بنارسی مفتی نے ضرور غلط بیانی کی ہے، مگر مذہبی پاس داری میں اس پر پردہ ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں، اگر یہ بات نہ ہوتی تو ''غالباً'' وغیرہ لکھنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی، بنارسی مفتی اب تک بنارس میں زندہ موجود ہیں اور ان سے دریافت کیا جا سکتا ہے کہ کیا انھوں نے اسی بنا پر امام اعظم کی دوسری روایت کا ذکر کیا ہے؟ اگر وہ اثبات میں جواب دیں تو ''غالباً'' کے بجائے یقیناً لکھنا چاہئے اور اگر نفی میں جواب ہو تو یہ ساری توجیہ بے کار اور ایک دوسری غلط بیانی ہے۔ ناظرین سمجھ سکتے ہیں کہ مجیب کے بنارسی مفتی سے نہ پوچھنے اور ''غالباً'' لکھنے میں کیا راز ہے۔

پھر یہ توجیہ بھی غلط در غلط ہے، اس لیے کہ اولاً تو نوادر کی کوئی روایت ہی نہیں ہے جیسا کہ اوپر معلوم ہوا۔

ثانیاً:- اگر ہوتی بھی تو اغاثہ کا حوالہ دینا پھر بھی غلط تھا، اس لیے کہ بنارسی مفتی نے یہ لکھا ہے کہ ''محمد ابن مقاتل نے اس روایت کو امام ابوحنیفہ سے نقل کیا ہے'' (دیکھو آثار ص ۱۱) اور اس کے لیے اغاثہ کا حوالہ دیا ہے، حالانکہ اغاثہ میں ابن مقاتل کا اس کو امام صاحب سے نقل کرنا کہیں مذکور نہیں ہے، ناظرین دیکھیں کہ مذہبی پاسداری میں کیسی کیسی ناجائز حمایت کی جا رہی ہے۔

ثالثاً: – ابن القیم نے امام ابوحنیفہ کے دوقولوں کا تو ذکر کیا نہیں ہے، مذہب ابوحنیفہ میں دوقولوں کا ذکر کیا ہے اور ظاہر ہے کہ قول فی المذہب اور شئے ہے اور قول امام شئے دیگر۔ آثار کے اسی صفحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مجیب کو ان دونوں کا فرق معلوم ہے، لیکن افسوس ہے کہ یہاں بنارسی کی حمایت بے جا میں وہ اس کو بھول گئے۔

میں نے اعلام میں لکھا تھا:

اسی طرح بے تردد یہ لکھ جانا بھی صحیح نہیں ہے کہ ''امام مالک کے دوقولوں میں سے ایک قول یہ بھی ہے'' اس لیے کہ خود اسی اغاثہ میں بتصریح مذکور ہے کہ مالکیہ میں سے تلمسانی وغیرہ نے اس کو مالک کے دوقولوں میں سے ایک قول لکھا ہے، مگر دوسرے مالکیہ نے کہا ہے کہ یہ مالک کا قول نہیں بلکہ مشائخ مالکیہ میں سے بعض کا قول ہے اور وہ بھی شاذ (دیکھو ص ۱۶۷) اسی طرح بعض اصحاب امام احمد کا ذکر بھی ابلہ فریبی ہے، اس لیے کہ خود ابن القیم نے صاف صاف لکھ دیا ہے کہ اگر بعض اصحاب امام احمد سے علامہ ابن تیمیہ کے جدامجد مراد ہوں تو ہوں ورنہ میں نے اور کسی حنبلی عالم کا یہ قول نہیں پایا۔ اور علامہ ابن تیمیہ نے کہا ہے کہ ہمارے دادا پوشیدہ طور پر کبھی کبھی یہ فتویٰ دیتے تھے (اغاثہ ص ۱۷۷)

سبحان اللہ! اپنی کتاب منتقی میں تو تین کے تین ہونے پر صحابہ کا اجماع بتایا ہے اور خود پوشیدہ طور پر اس کے خلاف فتوی دیتے تھے، یاللعجب! (اعلام ص ۲۳، ۲۴)

صاحب آثار لکھتے ہیں:

''ہرگز نہیں بلکہ صحیح ہے، جن مالکیوں کو امام مالک کے اس قول کا حال معلوم نہیں ہوا انھوں نے اس کو قول فی المذہب قرار دیا اور باقی مالکیوں کی ایک جماعت نے اس کو امام مالک کا ایک قول بیان کیا ہے اور تلمسانی نے تو سند بھی ذکر کردی ہے'' (آثار ص ۱۲۹)

جواب: – مجیب کا یہ خیال سراسر غلط ہے، صحیح یہ ہے کہ بعض مالکیوں نے غلط فہمی کی بنا پر اس کو امام مالک کا ایک قول لکھ دیا ہے جس کا کوئی ثبوت نہیں، چنانچہ علامہ خلیل مالکی نے تصریح فرمائی ہے کہ تلمسانی نے اس قول کی نسبت ذکر کیا ہے کہ وہ نوادر میں ہے، لیکن میں نے اس کو نہیں دیکھا، علامہ خلیل کے اس قول سے تلمسانی کی سند کی حقیقت بھی ظاہر ہوگئی، اور معلوم ہوگیا کہ یہ تلمسانی کی بھول ہے۔

صاحب آثار لکھتے ہیں:

''مولانا عبدالحی تحریر فرماتے ہیں: **وهو أحد القولين لمالك ولبعض أصحاب**

أحمد..... ..... (الی) مولف کی دوسری بات کا جواب بھی مولانا کی عبارت سے ہوگیا''۔

جواب:- مجیب صاحب اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ ہر مذہب والا اپنے مذہب سے زیادہ باخبر ہوتا ہے، مشہور ہے **صاحب البیت ادری بما فیہ**، جب علامہ خلیل مالکی فرماتے ہیں کہ میں نے امام مالک کا یہ قول نہیں دیکھا تو ان کے مقابلہ میں کسی غیر مالکی کا قول اس باب میں معتبر نہیں ہوسکتا، ہاں اگر کوئی شخص کسی معتبر کتاب میں امام مالک کا قول دکھادے تو بے شک اس کی سماعت کی جائے گی، **لکن دونہ خرط القتاد**، اسی سے مجیب کی دوسری بات کا بھی جواب ہوگیا، یعنی یہ کہ جب حنبلی حضرات خود ہی فرماتے ہیں کہ ہم کو کسی حنبلی کا یہ قول نہیں ملا تو کسی غیر حنبلی کا قول اس باب میں مسموع نہیں ہوسکتا الا بشرط مذکور۔ باقی آگے مجیب کا یہ کہنا کہ ''ابن قیم کا بھی یہی خیال ہے جو مولانا ـــــ فرماتے ہیں'' تو یہ صریح جھوٹ ہے، ابن قیم کی تصریح اعلام میں پیش کی جاچکی۔

یہاں پہنچ کر اہل حدیث ناظرین کو بغور ملاحظہ کرنا چاہئے کہ مجیب نے ابن تیمیہ کے جدامجد اوران کے پوشیدہ فتوے کا کوئی ذکر نہیں کیا، یعنی ع

کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

میں نے اعلام میں لکھا تھا:

چوتھی غلط بیانی یہ ہے کہ نہایت بے باکی سے کہہ دیا جاتا ہے کہ حضرت عمر نے تین طلاق کو جاری کردیا، لیکن جب اس ترکیب سے طلاق میں کمی نہیں ہوئی تو بہت پچھتائے اوراس سے رجوع کرلیا جیسا کہ حدیث کی بہت بڑی کتاب مسنداسماعیلی میں ہے: **قال عمر ماندمت علی شئ ندامتی علی ثلٰث أن لا أکون حرمت الطلاق** الخ دیکھو اغاثۃ ۱۸۲،۱۸۱، یعنی حضرت عمر فرماتے ہیں کہ مجھے تین مسئلوں میں بڑی ندامت ہوئی ان میں سے ایک یہ مسئلہ بھی ہے (انتہیٰ) مجھے مخالفین کی اس بے باکانہ غلط بیانی پر جتنا افسوس ہے اتنا اورکسی غلط بیانی پرنہیں ہے میں اگر اس غلط بیانی پر پوری طور سے روشنی ڈالوں تو کلام بہت طویل ہوجائے گا اس لیے اختصار کے ساتھ چند باتیں لکھتا ہوں:

(۱) حدیث کی کوئی بہت بڑی کتاب کیا کوئی بہت چھوٹی کتاب بھی مسنداسماعیلی نام کی نہیں ہے ہاں ابوبکر اسماعیلی کی ایک کتاب مسندعمر نام کی ضرور ہے، اوراسی سے ابن القیم نے یہ روایت نقل کی ہے۔

صاحب آثار نے صرف خط کشیدہ عبارت نقل کی ہے، اس کے بعد لکھا ہے کہ مسند اسماعیلی تو حدیث کی اتنی بڑی کتاب ہے کہ شاید ہی کوئی کتاب حدیث میں اتنی بڑی لکھی گئی ہو، شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ بستان میں تحریر فرماتے ہیں وراء ایں مستخرج الخ یعنی اسماعیلی کی اس مستخرج کے علاوہ اور بھی تصانیف ہیں ایک معجم ہے۔ ایک مسند بہت بڑی تقریباً سو جلدوں میں ہے لیکن (یہ اور مسانید کی طرح) مشہور نہ ہوئی اھ۔ مسند عمر اسی مسند کا کو ایک ٹکڑا ہے الخ

جواب:- اولاً شاہ صاحب نے اس مسند کا ذکر کر کے صاف صاف لکھ دیا کہ اس مسند کی شہرت نہیں ہوئی پس جب اس کی شہرت ہی نہیں ہوئی تو اس کا وجود و عدم برابر ہے، شاہ صاحب کے الفاظ مجیب نے یہ نقل کیے ہیں اما آن مشہور نگشتہ۔ جن کو مجیب نے اپنے مقصد کے خلاف پا کر اس کا ترجمہ یوں کر ڈالا ''لیکن (یہ اور مسانید کی طرح) مشہور نہ ہوئی'' حالانکہ اس عبارت کا لفظی ترجمہ صرف اتنا ہو سکتا ہے کہ ''لیکن وہ مشہور نہ ہوئی'' یعنی شاہ صاحب یہ فرماتے ہیں کہ اس مسند کی قطعا شہرت ہی نہیں اور مجیب نے اس کو یوں بنا ڈالا کہ شہرت ہوئی لیکن اور مسانید کی طرح نہیں ہوئی، کیا یہ غلط بیانی اور ترجمہ میں خیانت نہیں ہے؟ حاصل یہ کہ اگر اسماعیلی کی تصانیف میں مسند کا وجود ہو بھی تو چونکہ اس کی شہرت نہیں ہوئی اور لوگوں کے ہاتھوں وہ کتاب پڑی ہی نہیں اس لیے اس سے کوئی چیز نقل نہیں ہو سکتی، پس بنارسی کی غلط بیانی میں کچھ شبہہ نہیں ہے۔

ثانیاً:- یہ بھی جھوٹ ہے کہ مسند عمر مسند اسماعیلی کا ایک ٹکڑا ہے، مجیب اور ان کے بنارسی اثری مشیر سچے ہوں تو ثبوت پیش کریں، مسند عمر، ابوبکر اسماعیلی کی ایک مستقل کتاب ہے دو جلدوں میں مہذب ہوئی ہے، حافظ ذہبی فرماتے ہیں کہ **له معجم مروی و صنف الصحیح و اشیاء کثیرة من جملتها مسند عمر رضی اللہ عنه هذبه فی مجلدین طالعته** الخ یعنی اسماعیلی کا ایک معجم مروی ہے اور صحیح (مستخرج) اور بہت سی چیزیں تصنیف کیں، ان میں سے مسند عمر ہے جس کو انھوں نے دو جلدوں میں مہذب کیا ہے، میں نے اس کو دیکھا ہے، ذہبی کی اس عبارت کو غور سے پڑھئے اور دیکھئے کہ معجم و صحیح کے بعد انھوں نے یہ نہیں فرمایا کہ اسماعیلی کی تصنیفات میں ایک مسند کبیر بھی ہے جس کا ایک ٹکڑا مسند عمر ہے، بلکہ یہ فرمایا کہ اور بہت سی چیزیں بھی انھوں نے تصنیف کیں جن میں سے ایک مسند عمر ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ مسند عمر ان کی مستقل تصنیف ہے۔ اور یہ کہ ان کی تصنیفات میں مسند کبیر کا وجود نہیں ہے ورنہ اس سلسلہ میں اس کا ذکر ضرور آتا۔

ثالثاً :- میں نے یہ لکھا ہے کہ کوئی بہت چھوٹی کتاب بھی مسند اسماعیلی نام کی نہیں ہے اور اس نام کی کوئی کتاب مجیب صاحب ثابت نہیں کر سکے، شاہ صاحب کی عبارت سے مسند کبیر نام کی کتاب کا ثبوت ہو بھی جائے تو اس سے میرا کیا نقصان؟ اگر مجیب فرمائیں کہ وہ مسند کبیر اسماعیلی ہی کا تو ہے اس لیے بنارسی نے بجائے مسند کبیر کے مسند اسماعیلی لکھ دیا۔ تو عرض ہے کہ پھر اس کی کیا ضرورت تھی کہ بستان سے مسند کبیر کا ثبوت پیش کیا جاتا یہی کیوں نہ لکھ دیا گیا کہ مسند عمر (جس کے تصنیفات اسماعیلی میں سے ہونے کی تصریح میں نے خود اعلام میں کر دی ہے اسی) کو مسند اسماعیلی لکھ دیا ہے۔ اور بہت بڑی سے مراد بہت بلند رتبہ ہے یعنی جب بات ہی بنانی تھی تو یوں بھی بات بنائی جاسکتی تھی۔

میں نے اعلام میں لکھا تھا:

(۲) ہمارے مخالفین جب اپنے کسی دعوے کے ثبوت میں کوئی روایت پیش کرتے ہیں تو شاید یہ بھول جاتے ہیں کہ کسی روایت سے استدلال اسی وقت صحیح ہوسکتا ہے جب کہ وہ روایت صحیح بھی ہو، لہٰذا پیش کردہ روایت کی نسبت کسی محدث کی تصحیح یا کم از کم کتب رجال سے اسناد کے راویوں کی توثیق نقل کرنا ضروری ہے، چنانچہ یہاں بھی یہی ہوا کہ صرف روایت کا ایک ٹکڑا نقل کر دیا نہ کسی محدث کی تصحیح پیش کی نہ رجال اسناد پر کوئی گفتگو کی، پس مخالفین سے میرا مطالبہ ہے کہ کم از کم اس روایت کے رجال کی توثیق پیش کریں (اعلام ص ۲۴)

میرے اس مطالبہ نے مجیب اور ان کے اعوان وانصار کو ایسا عاجز ومبہوت بنا دیا جیسا کہ چاہئے۔ جس روایت کی بنا پر حضرت عمر کے رجوع کا باطل دعویٰ کیا جا رہا تھا اس کی تصحیح کی نسبت ایک حرف زبان سے نہ نکل سکا، مئو سے مبارک پور اور بنارس تک سناٹا چھا گیا، اور اس بدحواسی میں اور کچھ نہ بنا تو الٹے مجھ سے یہ مطالبہ کیا جانے لگا کہ '' آپ کا سب سے پہلا فرض ہے کہ اس کی تصحیح وتضعیف کی طرف توجہ کرتے'' حالانکہ اس کے متصل ہی مجیب یہ لکھ چکے ہیں کہ '' مفتی بنارس نے اپنا ایک استدلال پیش کیا ہے'' اب جس کو ذرا سی عقل اور تھوڑا سا علم بھی ہے وہ سمجھ سکتا ہے کہ جب بنارسی نے اس روایت سے استدلال کیا ہے اور اپنے دعوی رجوع کی دلیل اس کو قرار دیا تو اس دلیل کی صحت ثابت کرنا بنارسی یا ان کے وکیل کا فرض ہے یا نہیں۔ اگر مجیب صاحب فن مناظرہ کی ابجد سے بھی آشنا ہوتے تو مجھ سے کوئی مطالبہ نہ کرتے اس لیے کہ میرا تو صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ مجھ کو اس کی صحت تسلیم نہیں ہے۔ باقی رہا مجیب کا یہ اعتراض کہ میں نے حدیث مسلم وحدیث مسند کے صحت وسقم پر کیوں

گفتگو کی تو یہ بھی ان کی ناواقفیت وکم علمی پر مبنی ہے، ان کوفن مناظرہ کی کوئی کتاب پڑھ کر یہ معلوم کرنا چاہئے کہ معترض کواختیار ہوتا ہے کہ وہ مدعی کی دلیل پر تفصیلی نقض وارد کرے یا اجمالی، میں نے حدیث مسلم وحدیث مسند میں تفصیلی نقض وارد کیا ہے اور یہاں اختصار مدنظر تھا اس لیے اجمال سے کام لیا جیسا کہ میں نے خود تصریح کردی ہے کہ اگر اس غلط بیانی پر پورے طور سے روشنی ڈالوں تو کلام بہت طویل ہوجائے گا (دیکھو اعلام ص ۲۴)

اس کے بعد میں اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ مجیب اوران کے اعوان صاف صاف اقرار کریں کہ وہ اس روایت کی صحت ثابت کرنے اوراس کے رجال کی توثیق پیش کرنے سے قاصر ہیں تو میں اس روایت کی حقیقت اوراس کے رجال کا حال کھول کے رکھ دوں۔

میں نے اعلام لکھا تھا:

(۳) روایت کے ترجمہ میں انتہائی بے باکی کے ساتھ خیانت کی گئی ہے، بالکل لفظی ترجمہ روایت کا یوں ہے حضرت عمر نے فرمایا نہیں نادم ہوا میں کسی چیز پر مثل میرے نادم ہونے کے تین باتوں پر ایک یہ کہ نہ ہوا میں کہ حرام کرتا طلاق کو، یعنی ایک بات یہ ہے کہ میں نے طلاق کوحرام کیوں نہ کیا (**علی ما یستفاد من کلام ابن القیم**) مخالفین بتائیں کہ اس عبارت میں کہاں یہ ذکر ہے کہ ان تین باتوں میں سے ایک تین طلاقوں کے نافذ کردینے کا مسئلہ بھی ہے (اعلام ص ۲۴)

صاحب آثار نے ترجمہ کی خیانت کا یہ جواب دیا ہے کہ ''مفتی نے ......خیانت نہیں کی ہے بلکہ حاصل ترجمہ بیان کیا ہے یا یوں کہیے کہ نتیجۂ ترجمہ کولکھا ہے'' اس پر میری گذارش یہ ہے کہ جب حاصل ترجمہ بیان کرنا خیانت نہیں ہے تو آپ نے آثار ص ۴۴ میں عبارت ذہبی کے ترجمہ میں مجھ پر تحریف کا الزام کیوں قائم کیا؟ کیا یہ کھلی ہوئی بے انصافی اور بنارسی کی حمایت بے جا نہیں ہے؟ علاوہ بریں آپ چاہے اس کا حاصل ترجمہ نام رکھئے یا ترجمہ کہئے، بنارسی کی خیانت بہرحال ثابت ہے اس لیے کہ بنارسی نے اپنی عبارت میں وہ بات لکھی ہے جو روایت کے الفاظ سے ثابت نہیں ہوتی، پس اگر وہ ترجمہ ہے تو بنارسی نے ترجمہ میں خیانت کی اوراگر حاصل ترجمہ ہے تو حاصل ترجمہ ہی کے بیان میں بنارسی نے خیانت کی ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ روایت کے اس فقرہ **ان لا اکون حرمت الطلاق** کا حاصل ابن القیم کے خیال کے مطابق یہ ہے کہ ''میں نے طلاق کوحرام کیوں نہ کیا'' اور ہر آنکھ والا دیکھ سکتا ہے کہ اس عبارت میں ایک مجلس یا متعدد مجالس کی اسی طرح تین طلاق یا دو یا ایک کسی

کی تعیین وتصریح نہیں ہے، دوسری روایت میں نافذ کرنے کا بھی کوئی ذکر نہیں ہے، لہذا بنارسی کا اس کو ایک مجلس کی تین طلاقوں کے نافذ کرنے کی نسبت قرار دینا دووجہ سے تحریف وخیانت ہے۔

باقی رہا مجیب صاحب کا یہ کہنا کہ ''میں نے طلاق کو حرام کیوں نہ کیا''......کا اس کے سوا اور کیا مطلب ہوسکتا ہے کہ میں نے طلاق کو حرام کیوں نہ کیا، نافذ کیوں کیا، یعنی حضرت عمر نے ایک مجلس کی تین طلاقوں کو جو تین کردیا تھا اس پر ندامت کا اظہار فرمایا (آثار ص ۱۳۱) تو اس میں مجیب نے دو جگہ تحریف وخیانت سے کام لیا ہے: ایک یہ کہ مجیب نے ''حرام کیوں نہ کیا'' کا مطلب ''نافذ کیوں کیا'' قرار دیا، حالانکہ ایک جاہل بھی جانتا ہے کہ حرام کا مقابل حلال ہے اس لیے حرام کیوں نہ کیا کا مطلب ''حلال کیوں کیا'' ہوگا۔

دوسرے یہ کہ مجیب نے بلا کسی دلیل کے اپنی طرف سے روایت کا یہ مطلب بتایا کہ حضرت عمر نے ایک مجلس کی تین طلاقوں کو جو تین کردیا اس پر ندامت کا اظہار فرمایا، حالانکہ میں بتا چکا ہوں کہ روایت میں نہ ایک مجلس کا ذکر ہے نہ تین طلاقوں کی تصریح ہے، نہ نافذ کرنے کا کوئی تذکرہ ہے۔ لہذا مجیب سے یہ سوال ہے کہ وہ یہ ساری باتیں کہاں سے کہتے ہیں اگر کسی روایت سے تو وہ روایت پیش کریں اور اگر کسی روایت میں یہ تصریحات نہیں ہیں تو ان کی یا ابن القیم کی یہ خیالی واحتمالی وادعائی باتیں کون سن سکتا ہے؟ کیا مجیب اپنے یہ ارشادات بھول گئے (۱) محض حافظ ابن حجر کا یہ کہہ دینا کہ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ تین طلاقیں اکٹھی دی تھیں کیا استدلال کے لیے کافی ہوسکتا ہے جب کہ کسی حدیث مرفوع یا موقوف میں مذکور نہیں ہے کہ یہ کس طرح دی گئیں۔ (آثار ص ۶۸)

(۲) امام شافعی کے دعویٰ نسخ کی وجہ صرف ایک خیالی ناسخ ہے (ص ۲۶) ہم محتملات پر عمل کرنے کے مکلّف نہیں ہیں (ص ۲۸)

(۳) حافظ ابن حجر ایک احتمالی تاویل کی وجہ سے اس روایت سے استدلال کو موقوف قرار دیتے ہیں (ص ۔۔۔) حاصل یہ کہ خیالی واحتمالی باتیں آپ کے نزدیک مقبول نہیں ہیں، لہذا یا تو روایت میں ایک مجلس کی تین طلاقوں کے نافذ کرنے کا تذکرہ دکھایئے، یا دعویٰ رجوع اور اس روایت سے باز آیئے۔

میں نے اعلام کی عبارت منقولہ بالا کی اخیر سطر میں انھیں باتوں کی طرف اشارہ کیا تھا مگر آپ نے اس کو قطعاً نہیں سمجھا۔

اس کے بعد مجیب فرماتے ہیں کہ اور ''اظہار ندامت غلط اور خلاف ہی امر سمجھ کرتو کیا، پھر رجوع نہیں ہے تو اور کیا ہے'' (آثار ص ۱۳۱)

میں کہتا ہوں کہ سب سے پہلے مجیب روایت مذکورہ میں ایک مجلس کی تین طلاقوں کے نافذ کرنے پر ندامت ظاہر کرنے کی تصریح پیش کریں، اس لیے کہ جب تک یہ ثابت نہ ہوجائے کوئی بحث فضول ہے اور اس کو ان کے اولین وآخرین بھی ثابت نہیں کرسکتے۔ اس کے بعد میں مجیب کو یہ بھی بتادوں کہ اظہار ندامت صرف غلط ہی سمجھ کر نہیں ہوتا، بلکہ خلاف اولیٰ سمجھ کر بھی ہوتا ہے اور ابن القیم [۱] نے یہاں پر ترک اولیٰ ہی پر ندامت کا اظہار مانا ہے، پس اگر بفرض محال مجیب کی مذکورہ بالا خیالی باتیں صحیح بھی مان لی جائیں تو بھی اس روایت سے ثابت ہوگا کہ حضرت عمرؓ ایک مجلس کی تین طلاقوں کے تین ہونے کو جائز سمجھتے تھے، مجیب اس مقام پر اپنی آثار کا ص ۲۴ ملاحظہ فرمالیں۔

تنبیہ:

مجیب صاحب اچھی طرح سمجھ لیں کہ ''میں نے طلاق کو حرام کیوں نہ کیا'' کا یہ مطلب قرار دینا کہ ''نافذ کیوں کیا'' اس لیے غلط ہے کہ تحریم ثلاث حرمت تنفیذ کو مستلزم نہیں ہے [۲]۔ پس اگر مان بھی لیا جائے کہ حضرت عمرؓ نے تحلیل ثلاث پر ندامت ظاہر کی تو اس سے کسی طرح لازم نہیں آتا کہ ان کو تنفیذ ثلاث پر بھی ندامت ہوئی، بلکہ ہوسکتا ہے کہ وہ تنفیذ ثلاث کو تو بہرحال حق سمجھتے ہوں لیکن پہلے تین طلاق دینے کو جائز سمجھتے ہوں اور ان کو نافذ کرتے ہوں اور بعد میں تین طلاق کے جائز سمجھنے پر ندامت ہوئی ہو اور یہ سمجھ میں آیا ہو کہ تین طلاق دینا ناجائز ہے باوجود اس کے اگر کوئی دے دے گا تو واقع بھی ہوجائیں گی، حاصل یہ کہ اس ندامت کا تعلق تنفیذ سے کچھ بھی نہیں ہے بلکہ تین طلاق کے صرف جائز وناجائز سمجھنے سے ہے۔

ہمارے اس بیان کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایسی طلاق دینے والے کو دُرے لگائے ہیں اور اسی واقعہ میں یہ بھی فرمایا ہے کہ ''یہ تین طلاقیں ہیں اور جب تک عورت دوسرے سے نکاح نہ کرے پہلے شوہر کے لیے حلال نہیں ہوسکتی'' (دیکھو اغاثہ ص ۱۷۳)

اور مجیب نے آثار میں تسلیم کرلیا ہے کہ یہ اثر اظہار ندامت کے بعد کا ہوسکتا ہے، فرماتے

---

(۱) اخبر ان الاولیٰ کان عدوله الی تحریم الثلاث (اغاثہ) ۱۲ منہ

(۲) آثار صحابہ میں نہایت صراحت سے مذکور ہے کہ تین طلاق دینے والا گنہگار بھی ہوگا اور اس کی بی بی بھی حرام ہوجائے گی جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ تین طلاقیں دینی حرام بھی ہیں اور واقع بھی ہوجائیں گی۔ اور یہ مضمون حدیث دوم سے بھی ثابت ہے ۱۲ منہ

ہیں'' یہ کیوں نہیں ہوسکتا کہ اس کے بعد آپ (حضرت عمر) نے ایسی طلاق دینے والوں کو درے لگائے جیسا کہ دوسرے اثر سے معلوم ہوتا ہے'' (آثار ص ۱۳۱)

پس جب درہ لگانے والا اثر اظہار ندامت کے بعد کا ہوسکتا ہے تو مجیب کے قول سے لازم آ گیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو تنفیذ پر ندامت نہیں ہوئی تھی ورنہ لازم آئے گا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تنفیذ پر نادم ہونے کے بعد پھر نافذ کیا، یعنی اگر رجوع ثابت بھی ہو تو اس رجوع سے بھی رجوع کر لیا۔ کہئے جناب مجیب! اب بھی کچھ حوصلہ باقی ہے؟

تنبیہ آخر:

مجیب کو یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے یہ سب کچھ اس بات کے فرض کر لینے کے بعد ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کسی زمانہ میں تین طلاقوں کو جائز سمجھتے تھے جیسا کہ اغاثہ میں ہے، لیکن اعلام میں خود ابن القیم کے کلام سے ثابت کر دیا گیا ہے کہ یہی سرے سے صحیح نہیں ہے۔

میں نے اعلام میں لکھا تھا:

(۴) بفرض محال اس روایت میں مذکور بھی ہو کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تین کے نافذ کرنے پر اظہار ندامت کیا تو اتنے سے ان کا رجوع کیوں کر ثابت ہوسکتا ہے جب کہ کبھی اپنے سابق فتوے اور فیصلے کے خلاف کوئی فتویٰ نہیں دیا نہ اس کے خلاف فیصلہ کیا اور کم از کم جس طرح امضائے ثلاث کا مجمع صحابہ میں اعلان کیا تھا اسی طرح ندامت کا اعلان بھی ضروری تھا لیکن اس کا کچھ ثبوت نہیں (اعلام ص ۲۴ و ۲۵)

صاحب آثار لکھتے ہیں:

''بفرض محال نہیں بلکہ واقعۃً یہ اثر بتلا رہا ہے............اور اس سے آپ کا رجوع بخوبی ثابت ہے''

(ص ۱۳۱)

میں کہتا ہوں کہ واقعۃً بنانے اور بخوبی ثابت ہونے کا حال ابھی معلوم ہو چکا۔

اس کے بعد فرماتے ہیں ''اور آپ کا یہ کہنا کہ اپنے سابق فتوی اور فیصلہ کے خلاف کوئی فتویٰ نہیں دیا''، محض توہم ہی توہم ہے، کیا آپ حضرت عمر کے جملہ آثار کی تاریخ رکھتے ہیں اور بتا سکتے ہیں کہ فلاں اثر فلاں زمانہ کا ہے؟ ۔۔۔۔ یہ کیوں نہیں ہوسکتا کہ اس کے بعد آپ نے ایسے طلاق دینے والوں کو درے لگائے الخ (ص ۱۳۱)

میں کہتا ہوں کہ اگر میرا یہ کہنا کہ سابق فتویٰ اور فیصلے کے خلاف کوئی فتویٰ نہیں دیا توہم ہے،

تو کوئی ایک فتویٰ اس کے خلاف پیش کر دیجئے، نیز اگر میں جملہ آثار کی تاریخ نہیں رکھتا تو آپ یا بنارسی بھی تو نہیں رکھتے، پھر آپ اور وہ یہ کہاں سے کہتے ہیں کہ حضرت عمر نے تنفیذ ثلاث کے بعد ان لا اکون حرمت الطلاق فرمایا ہے، اگر کہئے کہ قرائن عقلی کی بنا پر کہتے ہیں تو پہلے صاف صاف لکھئے کہ قرائن عقلیہ سے تعیین تاریخ میں کوئی قباحت نہیں ہے اور اس کے بعد یہ بھی ارشاد ہو کہ اس کا حق تنہا آپ ہی کو ہے یا ہم کو بھی؟

علاوہ بریں آپ یہیں تسلیم کرتے ہیں کہ درہ لگانے والا اثر ندامت کے بعد کا ہوسکتا ہے، اور ابن القیم کی تحقیق کی بنا پر یہی ہونا ضروری بھی ہے، اس لیے کہ ندامت سے پہلے تو ان کے خیال میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ تین طلاقوں کو جائز سمجھتے تھے، لہذا تین طلاقوں کو جائز سمجھنے کے وقت میں درہ لگانا کیوں کر ہوسکتا ہے، پس لامحالہ وہ حرام سمجھنے اور ندامت کے بعد کا واقعہ ہے، اور اس واقعہ میں بھی تین طلاقوں کے واقع ہونے کا فتویٰ ہے۔ اسی طرح اعلام ص ۲۹ میں دار قطنی ص ۴۲۸ کے حوالہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا جو اثر مذکور ہے اس میں بھی تین طلاق دینے کو خدا کی نافرمانی قرار دیا ہے لہٰذا وہ بھی ندامت کے بعد ہی کا ہے، پس ان دونوں اثروں سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ندامت کے بعد بھی تین طلاقوں کے نافذ وواقع ہونے ہی کا فتویٰ دیا ہے۔ اور اس کے خلاف کوئی ایک فتویٰ بھی نہیں ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے تو ہم نہیں بلکہ واقعہ ہے، اور ایسا واقعہ جس کا نادانستہ طور پر مجیب نے بھی اعتراف کرلیا ہے، اور اسی سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ مجیب کا یہ کہنا کہ "یہ کیا ضرور ہے کہ رجوع کرنے کے بعد اس قسم کا کوئی واقعہ بھی پیش آیا ہوگا، (ص ۱۳۱) بالکل بے محل ہے، اس لیے کہ ابن القیم کے اصول سے دو واقعوں کا اس کے بعد پیش آنا ثابت ہے، اور ان دونوں میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فتویٰ بھی ہے کہ تینوں طلاقیں واقع ہوجاتی ہیں۔ ہاں مجیب سے یہ بھی پوچھنا چاہئے کہ یہ جو آپ فرمارہے ہیں وہ کوئی نص ہے یا محض خیالی احتمال ہے؟ اسی طرح آپ کا یہ فرمانا کہ "یہ تو کہئے کیا حضرت عمر نے کہیں خلوت میں دیواروں سے گفتگو کی تھی؟ آخر حضرات صحابہ ہی سے تو کہا ہوگا ورنہ ہم تک منقول ہوکر پہنچتا کیونکر؟" (ص ۱۳۲)

یہ کوئی آسمانی وحی ہے یا آپ کا پیدا کیا ہوا محض خیالی احتمال؟ اگر خیالی احتمال ہے اور یقیناً یہی ہے تو پھر دوسروں پر خیالی احتمال پیدا کرنے کا الزام قائم کرنا اور معترض ہونا، کہاں کی دیانت اور کون سا انصاف ہے؟

(جاری ہے)

اثنا عشری امامی شیعہ مذہب کے خدوخال

تحریر: سید محب الدین خطیب مصری ترجمہ: مسعود احمد الاعظمی

(پانچویں قسط)

ائمہ کے لیے دعوائے علم غیب

شیعہ لوگ اپنے بارہ اماموں کے لیے اس علم غیب کا دعویٰ کرتے ہیں، جس کا دعویٰ خود ان ائمہ کو بھی نہیں ہے، ائمہ کے سلسلے میں ان کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ وہ بشریت سے بالاتر ہیں۔ اسی کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو بذریعہ وحی، غیب کی جو باتیں بتلائیں جیسے آسمان وزمین کی تخلیق، جنت وجہنم کی صفات، ان کا وہ انکار کرتے ہیں۔ ''رسالۃ الاسلام'' نامی رسالے نے جو قاہرہ کے دارالتقریب سے شائع ہوتا ہے، جلد نمبر ۴ شمارہ نمبر ۴ میں صفحہ ۳۶۸ پر اس کو درج کیا ہے، جو کہ لبنان کے شیعہ مذہب کے سپریم کورٹ کے صدر کے قلم سے ہے، جس کو شیعہ عصر حاضر کا ممتاز عالم خیال کرتے ہیں، اس رسالے نے مذکورہ بالا عالم کا ایک مقالہ شائع کیا ہے جس کا عنوان ہے: مـــن اجتهـادات الشيعة الإمامية، اس میں انھوں نے اپنے مجتہد شیخ محمد حسن اشتیانی سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے اپنی کتاب ''بحر الفوائد'' جلد ا صفحہ ۲۶۷ میں لکھا ہے کہ پیغمبر جب احکام شرعیہ جیسے نواقض وضوء، اور حیض، ونفاس کے احکام بتلائیں، تو اس کی تصدیق اور اس پر عمل کرنا واجب ہے، اور جب غیبی امور سے متعلق کوئی بات بتلائیں، جیسے آسمان وزمین کی تخلیق، جنت کی حوروں اور اس کے محلات کے بارے میں، تو اس بات کے یقین ہونے کے باوجود کے پیغمبر نے اس کو کہا ہے- چہ جائیکہ اس کا صرف گمان ہو- اس پر ایمان لانا واجب نہیں ہے۔

ہائے رے تعجب! یہ لوگ جھوٹی باتیں گھڑ کر ان کو ائمہ کی جانب منسوب کرتے ہیں اور اس پر ایمان لاتے ہیں، جب کہ ائمہ کی طرف ان باتوں کی نسبت قطعی الثبوت نہیں ہے، اور غیب کی ان باتوں پر ایمان لانے کو ضروری نہیں خیال کرتے جو پیغمبر (ﷺ) سے ایسے ذرائع سے ثابت ہیں جو اپنی دلالت

میں قطعی ہیں، جیسے آسمان وزمین کی پیدائش اور جنت وجہنم کے بیان سے متعلق قرآن کریم کی آیتیں اور حدیثیں، جبکہ آنحضرت ﷺ سے کوئی ایسی بات ثابت نہیں ہے جو انھوں نے اپنی خواہش سے کہی ہو، آپ جو بات بھی بولتے ہیں تو وہ وحی ہے جو آپ کی طرف کی جاتی ہے۔ شیعوں نے اپنے اماموں کی طرف جو باتیں منسوب کی ہیں ان کے درمیان اور غیب کی ان باتوں کے درمیان مقابلہ کرے جو آں حضرت ﷺ سے صحیح طور سے ثابت ہیں، تو اسے معلوم ہوگا کہ قرآن اور صحیح ومتواتر حدیثوں میں آنحضرت ﷺ سے جو ثابت ہے، وہ اس کے ایک حصے کے برابر بھی نہیں ہے، جس کو شیعہ وحی الٰہی کے انقطاع کے بعد اپنے بارہ اماموں کے لیے علم غیب کا دعویٰ کرتے ہیں، ان بارہ اماموں سے غیبی باتوں کے تمام راویوں کا اہل سنت والجماعت کے علماء جرح وتعدیل کے نزدیک جھوٹا ہونا معروف ہے، لیکن ان کے شیعہ متبعین اس کی کچھ پروا نہیں کرتے اور ائمہ سے انھوں نے جو غیب کی باتیں نقل کی ہیں، ان کی تصدیق کرتے ہیں، جب کہ ''رسالۃ الاسلام'' نامی میگزین جس کو دارالتقریب شائع کرتا ہے، اور لبنان کی مذہبی سپریم کورٹ کا قاضی، اوران کا مجتہد محمد حسن اشتیانی آنحضرت ﷺ سے صحیح طریقے سے ثابت غیب کی باتوں کی تصدیق کے عدم وجوب کا دھوم دھام سے تذکرہ کرتے ہیں، اور یہ چاہتے ہیں کہ رسالت محمدیہ کو وضو کے نواقض اور حیض ونفاس کے احکام جیسے فقہی مسائل تک محدود کردیں۔

ائمہ کا مقام پیغمبر سے بڑھ کر

غیبی باتوں میں وہ اپنے ائمہ کا مقام پیغمبر ﷺ کے مقام سے اوپر قرار دیتے ہیں جب کہ آپ ﷺ پر وحی نازل ہوتی تھی، اور اماموں نے کبھی وحی کا دعویٰ نہیں کیا[1]، مجھے سمجھ میں نہیں آتا اس

(۱) یہ معاملہ صرف غیبی باتوں تک ہی موقوف نہیں ہے، اس لیے کہ خمینی نے لکھا ہے کہ: ہمارے مذہب کے عقائد میں یہ بھی ہے کہ ہمارے اماموں کو وہ مقام حاصل ہے جو کسی مقرب فرشتے اور پیغمبر کو نہیں حاصل ہے، اور یہ بھی لکھا ہے کہ: ائمہ اس عالم سے پہلے نور تھے جو عرش الٰہی کا احاطہ کیے ہوئے تھے، اوران کا وہ مقام اور قرب خداوندی حاصل تھا جس کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ جبریل نے کہا ہے کہ اگر میں ایک انگشت کے برابر قریب ہوتا تو جل جاتا۔ جب کہ ائمہ سے خود منقول ہے کہ اللہ کے ساتھ ہمارے کچھ ایسے حالات ہیں، جو کسی مقرب فرشتے اور نبی مرسل کو حاصل نہیں ہیں (**الحکومة الإسلامية**، ص:۵۲) اور اسی کتاب میں لکھا ہے کہ ''ائمہ کی تعلیمات قرآن کی تعلیمات کی طرح ہیں (ص:۱۱۳)۔ اور ہارون نام کے ایک شیعہ معتقد کے بارے میں ہے کہ اس کو جب امام نے حکم دیا تو اس نے اپنے آپ کو آگ میں ڈال لیا، چنانچہ **معاهدة الإمام حسين** نامی ایک کتاب میں لکھا ہے کہ: ہارون جو مکہ کا باشندہ ہے، یہ بات اچھی طرح جانتا ہے کہ امام کسی بھی عیب یا خطا سے پاک ہے، اور یہ کہ ہم کو سوائے ان کے کسی اور کی اطاعت نہیں کرنی ہے، حتی کہ اگر وہ اللہ کی عبادت کے ضروری نہ ہونے کا حکم دیں تب بھی ان کی پیروی کی جائے گی (ص:۵-۶) (س)

کے بعد ہمارے اوران کے درمیان اتحاد ویگانگت کیسے ممکن ہے؟

تاریخ کے ہر دور میں شیعوں کی اکثریت اور اسلامی حکومتوں کے تئیں ان کے خاص وعام کے موقف میں یہ بات دیکھی جا سکتی ہے کہ کوئی بھی اسلامی حکومت جب مضبوط اور راسخ ہوتی ہے تو شیعہ لوگ عقیدہ ''تقیہ'' پر عمل کرتے ہوئے اپنی زبانوں سے اس کی چاپلوسی کرتے ہیں، تاکہ اس کی دولت وثروت سے فائدہ اٹھا سکیں، اوراس کے عہدوں اور منصبوں پر فائز ہوسکیں، لیکن جب حکومت کمزور ہوجاتی ہے یا کسی دشمن کے حملے کا شکار ہوجاتی ہے، تو دشمن سے مل کر اس اسلامی حکومت کے خلاف بغاوت کر دیتے ہیں، یہی کام انھوں نے اموی حکومت کے آخر میں کیا، جس وقت اموی خلفاء کے خلاف ان ہی کے خاندان کے عباسیوں نے علم بغاوت بلند کیا، بلکہ ان کے خلاف عباسیوں کی بغاوت شیعوں کی ہی عیاری، دسیسہ کاری اور اشتعال انگیزی کا نتیجہ تھی، پھران کا یہی مجرمانہ رویہ اس وقت عباسی حکومت کے ساتھ بھی رہا، جس وقت ہلاکو خان اور تاتاریوں کے حملے خلافت اسلامیہ اور اس کے مرکز علم وفن وتہذیب وتمدن کے لیے چیلنج بنے ہوئے تھے۔ چنانچہ شیعوں کا عالم نصیر طوسی جو کبھی عباسی خلیفہ معتصم کا قرب حاصل کرنے کے لیے اس کی شان میں قصیدے کہا کرتا تھا ۶۵۵ھ میں غداری کی اور معتصم کے خلاف اور بغداد میں اسلام کو کمزور کرنے کے لیے اشتعال انگیزی کرنے لگا، اور ہلاکو جیسے خونریز وسفاک کے لشکر کے ساتھ ساتھ رہا، اور مسلمانوں کے قتل عام اور بوڑھوں وبچوں کو تہ تیغ کرنے میں اس کا شریک کار رہا۔ اسلامی علم وفن کی ان کتابوں کو دجلہ میں غرقاب کرنے سے خوش ہوتا رہا، جن کی روشنائی سے اس دریا کا پانی کئی روز تک سیاہ ہوکر بہتا رہا، جن کی غرقابی سے تاریخ، ادب، لغت اور شعر وحکمت کا بیش قیمت اسلامی سرمایہ ضائع ہوگیا، شرعی علوم اور ائمۂ سلف کی وہ تصانیف مزید برآں ہیں جو اولین دور میں تصنیف کی گئی تھیں اوراس وقت تک بکثرت موجود تھیں، ان کتابوں کی بربادی ایسا علمی المیہ اور سانحہ ہے جس کی کوئی نظیر تاریخ میں موجود نہیں ہے۔

(جاری ہے)

وراثت میں بیٹیوں کا حق

از: مفتی جاوید احمد
استاذ و مفتی مدرسہ مرقاۃ العلوم، مئو

میراث کی تقسیم کے بارے میں شرعی حکم نہ ماننا اور لڑکیوں کو ان کے حق سے محروم کرنا اور ان کو ان کا حق نہ دینا بہت سخت گناہ کا کام ہے، بلکہ حد کفر تک پہنچ جانے کا اندیشہ ہے۔

(فتاویٰ رحیمیہ ج۵ص۵۱۳)

لڑکیوں اور بہنوں کو میراث سے محروم کرنا اور ان کا حصہ نہ دینا اور صرف لڑکوں یا بھائیوں کا آپس میں تقسیم کر لینا سخت حرام اور گناہ کبیرہ ہے اور لڑکیوں اور بہنوں پر بہت بڑا ظلم ہے، اللہ رب العزت نے قرآن پاک میں لڑکیوں اور بہنوں اور بیویوں کے حصوں کو خاص طور سے بیان فرمایا ہے:

لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ٥ (سورۂ نساء) مردوں کے لیے بھی حصہ ہے اس چیز میں سے جس کو ماں باپ اور بہت نزدیک کے قرابت دار چھوڑ جاویں اور عورتوں کے لیے بھی حصہ ہے اس چیز میں سے جس کو ماں باپ اور بہت نزدیک کے قرابت دار چھوڑ جاویں خواہ وہ چیز قلیل ہو یا کثیر ہو حصہ قطعی (مقرر کیا ہوا ہے)

اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ اوس بن ثابت رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا، دو لڑکیاں ایک لڑکا نابالغ اور ایک بیوی وارث چھوڑا، عرب کے قدیم دستور کے مطابق ان کے دو چچا زاد بھائیوں نے آکر مرحوم کے پورے مال پر قبضہ کر لیا اور اولاد اور بیوی کو کچھ نہ دیا، کیونکہ ان کے نزدیک عورت تو مطلقاً مستحق وراثت نہ سمجھی جاتی تھی، خواہ بالغ ہو یا نابالغ، اس لیے بیوی اور دونوں لڑکیاں تو یوں محروم ہو گئیں اور لڑکا بوجہ نابالغ ہونے کے محروم کر دیا گیا، لہٰذا پورے مال کے وارث دو چچا زاد بھائی ہو گئے۔ اوس بن ثابت رضی اللہ عنہ کی بیوی نے یہ بھی چاہا کہ یہ چچا زاد بھائی جو پورے ترکہ پر قبضہ کر

رہے ہیں تو ان دونوں لڑکیوں سے شادی بھی کرلیں تاکہ ان کی فکر سے فراغت ہو، مگر انھوں نے یہ بھی قبول نہ کیا، تب اوس بن ثابت رضی اللہ عنہ کی بیوہ نے رسول کریم ﷺ سے عرض حال کیا اور اپنی اور اپنے بچوں کی بیکسی اور محرومی کی شکایت کی، اس وقت تک چونکہ قرآن کریم میں آیت میراث نازل نہ ہوئی تھی، اس لیے آپ ﷺ نے جواب دینے میں توقف فرمایا، آپ ﷺ کو اطمینان تھا کہ وحی کے ذریعہ اس ظالمانہ قانون کو ضرور بدلا جائے گا، چنانچہ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی، اس کے بعد آپ ﷺ نے ان کے دونوں چچازاد بھائیوں کو بلایا اور ان سے میراث لے کر اوس ابن ثابت رضی اللہ عنہ کی بیوی کو ثمن یعنی آٹھواں حصہ دیا اور بقیہ کو ان کی اولاد کے درمیان تقسیم کردیا اور چچازاد بھائیوں کو کچھ بھی نہیں دیا۔ (روح المعانی ج۴ص۲۱۰)

عورتوں کو میراث سے حصہ نہ دینا زمانۂ جاہلیت کی ایک بری رسم تھی، اسلام نے اس کو ختم کرکے ان کو حقوق دلائے، اس آیت میں مما قل منه او کثر فرما کر ایک دوسری جاہلانہ رسم کی اصلاح فرمائی گئی ہے، وہ یہ کہ بعض قوموں میں بعض اقسام مال کو بعض خاص وارثوں کے لیے مخصوص کرلیا جاتا تھا، مثلاً گھوڑا اور تلوار وغیرہ اسلحہ یہ سب صرف نوجوان مردوں کا حق تھا، دوسرے وارثوں کو ان سے محروم کردیا جاتا تھا، قرآن کریم کی اس ہدایت نے بتلادیا کہ میت کی ملکیت میں جو چیز بھی تھی خواہ بڑی ہو یا چھوٹی ہو ہر چیز میں ہر وارث کا حق ہے، کسی وارث کو کوئی خاص چیز بغیر تقسیم کے خود رکھ لینا جائز نہیں، آخر آیت میں جو ارشاد فرمایا نصیباً مفروضاً اس سے یہ بھی بتلادیا کہ مختلف وارثوں کے جو مختلف حصے قرآن نے مقرر فرمائے ہیں یہ خدا کی طرف سے مقرر کردہ حصے ہیں، ان میں کسی کو اپنی رائے اور قیاس سے کمی بیشی یا تغیر وتبدل کا کوئی حق نہیں اور اسی لفظ ''مفروضا'' سے ایک اور مسئلہ یہ بھی معلوم ہوا کہ وراثت کے ذریعہ جو ملکیت وارثوں کی طرف منتقل ہوتی ہے ملکیت جبری ہے، نہ اس میں وارث کا قبول کرنا شرط ہے نہ اس کا اس پر راضی ہونا ضروری ہے، بلکہ اگر وہ زبان سے بصراحت یوں بھی کہے کہ میں اپنا حصہ نہیں لیتا تب بھی وہ شرعاً اپنے حصے کا مالک ہوچکا، یہ دوسری بات ہے کہ وہ مالک بن کر شرعی قاعدہ کے مطابق کسی دوسرے کو ہبہ کردے یا بیچ ڈالے یا تقسیم کردے۔

(معارف القرآن ج۲ص۳۱۲)

اسی سورۂ نساء میں دوسری آیت ہے (یُوْصِیْكُمُ اللّٰهُ فِیْۤ اَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ

الْأُنْثَيَيْنِ ج فَاِنْ كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ج وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ط) اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے تمھاری اولاد کے باب میں لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے حصہ کے برابر اور اگر صرف لڑکیاں ہی ہوں گو دو سے زیادہ ہوں تو ان لڑکیوں کو دو تہائی ملے گا اس مال کا جو مورث چھوڑ کر مرا ہے اور اگر ایک ہی لڑکی ہو تو اس کو نصف ملے گا۔

قرآن مجید نے لڑکیوں کو حصہ دلانے کا اس قدر اہتمام کیا ہے کہ لڑکیوں کے حصہ کو اصل قرار دے کر اس کے اعتبار سے لڑکوں کا حصہ بتلایا اور بجائے للأنثيين مثل حظ الذكر (دو لڑکیوں کو ایک لڑکے کے حصہ کے بقدر) فرمانے کے للذكر مثل حظ الانثيين (لڑکے کو دو لڑکیوں کے حصہ کے بقدر) کے الفاظ سے تعبیر فرمایا۔ جو لوگ بہنوں کو حصہ نہیں دیتے اور وہ یہ سمجھ کر با دل ناخواستہ شرما شرمی معاف کر دیتی ہیں کہ ملنے والا تو ہے ہی نہیں تو کیوں بھائیوں سے برائی لی جائے، ایسی معافی شرعاً معافی نہیں ہوتی، ان کا حق بھائیوں کے ذمہ واجب رہتا ہے، یہ میراث دبانے والے سخت گنہگار ہیں، ان میں بعض بچیاں نابالغ بھی ہوتی ہیں، ان کا حصہ نہ دینا دوہرا گناہ ہے ایک گناہ وارث شرعی کے حصہ کو دبانے کا اور دوسرا یتیم کے مال کو کھانے کا۔ (معارف القرآن ج۲ ص۳۲۱)

زمانہ جاہلیت میں عورتوں کو بالکل ہی میراث سے محروم رکھا جاتا تھا، حضرت نبی کریم ﷺ نے اس بری رسم کو ختم کیا۔ اس سلسلہ میں حدیث شریف میں ایک قصہ آیا ہے، حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم لوگ حضرت نبی کریم ﷺ کے ہمراہ باہر نکلے، اتنے میں ہمارا گزر اسواف میں ایک انصاری عورت پر ہوا، وہ عورت اپنی دو لڑکیوں کو لے کر آئی اور کہنے لگی کہ اے اللہ کے رسول ﷺ یہ دونوں لڑکیاں ثابت بن قیس (میرے شوہر) کی ہیں، جو آپ کے ساتھ غزوۂ احد میں شہید ہو گئے ہیں، ان لڑکیوں کا چچا ان کے پورے مال اور ان کی پوری میراث پر خود قابض ہو گیا ہے اور ان کے واسطے کچھ باقی نہیں رکھا، اس معاملہ میں آپ کیا فرماتے ہیں؟ خدا کی قسم اگر ان لڑکیوں کے پاس مال نہ ہوگا تو کوئی شخص ان کو نکاح میں رکھنے کے لیے بھی تیار نہ ہوگا، رسول اللہ ﷺ نے یہ سن کر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تیرے حق میں فیصلہ فرمادے گا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ پھر جب سورۃ النساء کی یہ آیت يُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِيٓ اَوْلَادِكُمْ نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اس عورت اور اس کے دیور کو (لڑکیوں کا وہ چچا جس نے سارے مال پر

قبضہ کرلیا تھا) بلاؤ، آپ ﷺ نے لڑکیوں کے چچا سے فرمایا کہ لڑکیوں کوکل مال کا دوتہائی حصہ دو، ان کی ماں کوآٹھواں حصہ اور جو بچے وہ تم خود رکھ لو۔ امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ بشر نے اس میں غلطی کی ہے یہ دونوں لڑکیاں سعد بن الربیع کی تھیں اور ثابت بن قیس تو شہید ہوئے جنگ یمامہ میں۔

عن جابر بن عبداللّٰه قال خرجنا مع رسول اللّٰه ﷺ حتى جئنا إمرأة من الانصار في الأسواف فجاء ت المرأة بابنتين لها فقالت يا رسول اللّٰه هاتان بنتا ثابت بن قيس قتل معک يوم أحد وقد استفاء عمهما مالهما وميراثهما كله ولم يدع لهما مالاً إلا أخذه فما ترىٰ يا رسول اللّٰه فواللّٰه لا تنكحان (ابدا)الاولهما مال، فقال رسول اللّٰه ﷺ يقضى اللّٰه في ذلک وقال: نزلت سورة النساء يوصيكم اللّٰه فى أولادكم الآية فقال رسول اللّٰه ﷺ: ادعو إلى المرأة وصاحبها فقال لعمهما: أعطهما الثلثين وأعط أمهما الثمن، ومابقى فلک. قال ابوداؤد: وأخطأ بشر فيه انما هما ابنتا سعد بن الربيع، وثابت بن قيس قتل يوم اليمامة (ابوداؤد شريف ص ٤٠٠)

اسی طرح کی روایت ترمذی شریف ج ۲ ص ۳۰ میں بھی ہے۔

قرآن کریم میں میراث کے حصوں کے بیان کرنے کے بعد ایک جگہ تو اللہ رب العزت نے **فريضة من اللّٰه** فرمایا یعنی یہ حکم منجانب اللہ مقرر کردیا گیا۔

اس آیت کی تفسیر میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: قرآن کریم کی اس آیت نے بتلادیا کہ میراث کے جو حصے اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائے ہیں وہ اس کا طے شدہ حکم ہے اس میں کسی کورائے زنی یا کمی بیشی کا کوئی حق نہیں اور تمھیں پورے اطمینان قلب کے ساتھ اسے قبول کرنا چاہئے، تمھارے خالق و مالک کا یہ حکم بہترین حکمت و مصلحت پر مبنی ہے، تمھارے نفع کا کوئی پہلو اس کے احاطہ علم سے باہر نہیں ہے اور جو کچھ حکم وہ کرتا ہے کسی حکمت سے خالی نہیں ہوتا، تمھیں خود اپنے نفع و نقصان کی حقیقی پہچان نہیں ہوسکتی، اگر تقسیم میراث کا مسئلہ خود تمھاری رائے پر چھوڑ دیا جاتا تو تم ضرور اپنی کم فہمی کی وجہ سے صحیح فیصلہ نہ کرپاتے اور میراث کی تقسیم میں بے اعتدالی ہوجاتی، اللہ جل شانہ نے یہ فریضہ اپنے ذمہ لے لیا تا کہ مال کی تقسیم میں عدل و انصاف کی پوری پوری رعایت ہو اور

میت کا سرمایہ منصفانہ طریقہ سے مختلف مستحقین کے ہاتھوں میں گردش کرے۔

(معارف القرآن ج ۲ ص ۳۲۴)

اور دوسری جگہ وَصِيَّةً مِنَ اللّٰهِ ہے، یعنی یہ حکم کیا گیا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے۔ میراث کے حصے بیان کرنے کے بعد اللہ پاک نے ارشاد فرمایا وَصِيَّةً مِنَ اللّٰهِ یعنی جو کچھ حصے مقرر کیے گئے اور دین اور وصیت کے بارے میں جو تاکید کی گئی اس سب پر عمل کرنا نہایت ضروری ہے، اللہ پاک کی طرف سے ایک عظیم وصیت اور مہتم بالشان حکم ہے، اس کی خلاف ورزی نہ کرنا، پھر مزید تنبیہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ یعنی اللہ تعالیٰ سب جانتا ہے اور اس نے اپنے علم سے ہر ایک کا حال جانتے ہوئے حصے مقرر فرمائے، جو احکام مذکورہ پر عمل کرے گا اللہ کے علم سے اس کی یہ نیکی باہر نہ ہوگی اور جو خلاف ورزی کرے گا اس کی یہ بدکرداری بھی اللہ کے علم میں آئے گی جس کی پاداش میں اس سے مواخذہ کیا جائے گا، نیز جو کوئی مرنے والا دین یا وصیت کے ذریعہ سے ضرر پہنچائے گا اللہ کو اس کا بھی علم ہے اس کے مواخذہ سے بے خوف نہ رہو، ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ خلاف ورزی کرنے پر اس دنیا میں سزا نہ دے اس لیے کہ وہ حلیم ہے خلاف ورزی کرنے والے کو یہ دھوکا نہ لگنا چاہئے کہ میں بچ گیا۔ (معارف القرآن ج:۲، ص:۳۳۱)

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ.) یہ سب احکام مذکورہ خداوندی ضابطے ہیں اور جو شخص اللہ اور رسول کی پوری اطاعت کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو ایسی بہشتوں میں داخل کردیں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی ہمیشہ ہمیشہ ان میں رہیں گے اور یہ بڑی کامیابی ہے اور جو شخص اللہ اور رسول کا کہنا نہ مانے گا اور بالکل ہی اس کے ضابطوں سے نکل جاوے گا اس کو آگ میں داخل کریں گے اس طور سے کہ وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہے گا اور اس کی ایسی سزا ہوگی جس میں ذلت بھی ہے۔

میراث کے مذکورہ احکام بیان کرنے کے بعد ان دو آیتوں میں ان احکام کو ماننے اور ان پر عمل کرنے کی فضیلت اور نافرمانی کرنے کی بری عاقبت کا بیان ہے جس سے احکام مذکورہ کی اہمیت

مقصود ہے قرآن کریم کا یہ اسلوب ہے کہ احکام وعقائد کے بیان کے بعد تتمہ کے طور پر ماننے والوں کے لیے ترغیب اوران کی فضیلت کا ذکر ہوتا ہے اور نہ ماننے والوں کے لیے ترہیب وسزا اوران کی مذمت مذکور ہوتی ہے یہاں بھی چونکہ احکام کا ذکر تھا اس لیے آخر کی ان دو آیتوں میں اطاعت کرنے والوں اور نافرمانوں کے نتائج کا ذکر کر دیا گیا۔　　(معارف القرآن ج:۲،ص:۳۳۱،۳۳۲)

وراثت سے محروم کرنے کا گناہ:

کسی بھی وارث کو محروم کرنے یعنی حصہ نہ دینے پر حدیث شریف میں بھی بڑی سخت وعیدیں وارد ہوئی ہیں: **عن أبی هريرة عن رسول اللّٰه ﷺ قال ان الرجل ليعمل والمرأة بطاعة اللّٰه ستين سنة ثم يحضرهما الموت فيضاران فی الوصية فتجب لهما النار ثم قرأ ابوهريرة من بعد وصية يوصىٰ بها اودين غير مضار الىٰ قوله تعالىٰ وذلک الفوز العظيم. رواه أحمد** (مشکوٰۃ شریف ج۱ص۲۶۵) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: بلا شبہہ مرد اور عورت ساٹھ سال تک اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتے ہیں پھر موت کے وقت کسی وارث کو ضرر پہنچانے کا پہلو اختیار کرتے ہیں تو ان کے لیے جہنم واجب ہو جاتی ہے پھر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے سورۂ نساء کی آیت مِنۡ بَعۡدِ وَصِيَّةٍ يُّوۡصٰى بِهَآ اَوۡ دَيۡنٍ غَيۡرَ مُضَآرٍّ سے ذٰلِکَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِيۡمُ تک تلاوت فرمائی۔اس حدیث کی شرح میں ملا علی قاری علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں، **فيضاران فی الوصية من المضارة ای يوصلان الضرر الی الوارث بسبب الوصية للاجنبی باكثر من الثلث او بان يهب جميع ماله لواحد من الورثة كيلا يرث وارث اٰخرمن ماله شيئاً فهذا مكروه وفرار عن حكم اللّٰه تعالىٰ.**　　(مرقاۃ ج:۳ جزء۶،ص:۱۸۴)

یعنی مرد وعورت نقصان پہنچاتے ہیں وارث کو اجنبی کو تہائی مال سے زیادہ وصیت کرکے یا کسی ایک ہی وارث کو پورا مال ہبہ کرکے، تاکہ کوئی دوسرا وارث اس کے مال میں وراثت نہ پائے یہ مکروہ (تحریمی) ہے اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے فرار ہے۔

وارث کو محروم کرنے کی وعید میں دوسری حدیث یہ ہے: **عن أنس قال قال رسول اللّٰه ﷺ: من قطع ميراث وارثه قطع اللّٰه ميراثه من الجنة رواه ابن ماجه ورواه البيهقی**

فی شعب الایمان. (مشکوۃ شریف ج:۱،ص:۲٦٦)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اپنے وارث کو میراث سے محروم کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن جنت سے محروم کردے گا۔

میراث اضطراری اور جبری ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کو متعین کیا یہ کسی کے ساقط کرنے سے ساقط نہیں ہوگی۔ اضطراری وهو الميراث وسمیٰ فرائض لان الله تعالیٰ قسمه بنفسهٖ واوضحه وضوح النهار بشمسهٖ قوله بنفسهٖ ای ولم يفوض تقديره الیٰ ملک مقرب ولا نبی مرسل بخلاف سائر الأحكام كالصلوٰة والزكوٰة والحج وغيرها فإن النصوص فيها مجملة. (الدرالمختار مع ردالمختار ج:۱۰،ص:۴۹۲)

الارث جبری لا يسقط بالاسقاط (تکملۃ ردالمختار ج:۱۱،ص:٦۷۸) مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: غفلت کرنا احکام خداوندی سے بھی موجب گناہ ہے، لہٰذا اگر زید ہمشیرگان (بہنوں) اور اناث (لڑکیوں) کا حق شرعی اپنی اور اپنے مورث کی جائداد میں سے ادا نہ کرے گا اور حقداروں کو نہ پہنچائے گا تو مواخذہ حق العباد کا اس کی گردن پر رہے گا اور اس وجہ سے وہ گنہ گار اور عاصی ہوگا، قانون شرعی کو ترک کرکے قانون دنیاوی کو اختیار کرنا اور اس پر کاربند ہونا سخت مذموم وممنوع ہے اور موجب نکال آخرت ہے۔ لڑکیوں کا حق وراثت اللہ نے مقرر فرمایا ہے۔ اس کو کوئی باطل نہیں کرسکتا اور جو لوگ اس کے مقابلہ میں رواج کو پیش کرکے لڑکیوں کا حق باطل کرنا چاہتے ہیں وہ سخت گنہ گار ہیں اور عذر مذکور ان کا باطل ہے، ان کے ان اعذار باردہ وتاویلات رکیکہ سے لڑکیوں کا حقِ میراث ساقط نہ ہوگا، بے شک حقوق اسلام میں سے یہ ہے کہ جو لوگ لڑکیوں کے حق کو باطل کرتے ہیں اور رواج ہنود کو ترجیح دینے میں کوشش کریں ان سے سلام کلام ترک کردیا جائے اور شرکت ان کی شادی وغمی میں نہ کی جائے تاکہ ان کو عبرت ہو اور اس فعل مذموم سے نادم ہوں۔ فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ج۷ ص ۴۹۹-۵۰۰۔

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نوراللہ مرقدہ لکھتے ہیں کہ بعضے لوگ لڑکیوں کو میراث نہیں دیتے یہ بالکل غلط ہے حرام اور ظلم ہے (اغلاط العوام ص:۲۱۵)

لڑکیوں کو میراث سے محروم کرنے کا رواج اس قدر جڑ پکڑ گیا ہے کہ اکثر عورتیں اپنا حصہ

میراث طلب کرنے میں حیا اور حجاب محسوس کرتی ہیں، اگر کوئی لڑکی اپنا حق مانگے تو دوسرے رشتہ دار بھی اسے عار دلاتے ہیں، اس لیے بہت سی عورتیں چاہتے ہوئے اور ضرورت مند ہوتے ہوئے بھی نہیں لے سکتیں۔ اور شرمی شرما میں معاف کردیتی ہیں، یہ معاف نہیں ہوتا اور اس کا گناہ بھائیوں پر ہوگا۔ اس سلسلہ میں حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب قدس سرہ لکھتے ہیں کہ زیادہ دستور یہ ہوگیا ہے کہ بیٹیوں اور پوتیوں کو مورث کے مرنے کے بعد میراث سے اور زندگی میں ہبہ سے محروم رکھا جاتا ہے اور اس ظلم عظیم کے لیے یہ عذر پیش کیا جاتا ہے کہ بیٹیاں اور پوتیاں اپنا حصہ چھوڑنے پر راضی ہیں، حالانکہ وہ دستور جاہلیت کی بنا پر شرم کی وجہ سے خاموش رہتی ہیں، طیب خاطر سے اپنا حصہ نہیں چھوڑتیں، اس لیے ایسا کرنا جائز نہیں، بلکہ طیب خاطر کا یقین ہونے کی صورت میں بھی چونکہ اس سے رسم جاہلیت اور ظلم عظیم کی تائید ہوتی ہے اس لیے جائز نہیں۔ (احسن الفتاویٰ ج۹ص ۲۹۹)

بدقسمتی سے ہندوستان میں مسلمانوں نے برادران وطن سے جن غیر اسلامی طریقوں کو سیکھا اور ان کو گلے لگایا ان میں سے ایک عورتوں کو میراث کے حق سے محروم رکھنا بھی ہے، آجکل بہت سے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ہم لوگ لڑکیوں کی شادی میں کافی پیسہ خرچ کرتے ہیں اور ان کو کافی جہیز دیتے ہیں تو پھر میراث میں کیسا حق؟ یہ بہت بڑا شیطانی دھوکہ ہے۔ اس سے لڑکیوں کا حق میراث ختم نہیں ہوگا۔ یہ عجیب بات ہے کہ شریعت نے جس بات کو منع کیا ہے اس کا ارتکاب کیا جاتا ہے، نکاح کو آسان رکھا گیا ہے اس میں لڑکی کے باپ بھائی وغیرہ پر کوئی مالی ذمہ داری نہیں رکھی گئی ہے، لیکن بارات اور شادی کے بیجا خرچ اور جہیز نے سماج کی کمر توڑ دی ہے اور لڑکی ماں باپ کے لیے ایک بوجھ بن گئی ہے اور جس چیز کا شریعت نے حکم دیا ہے یعنی حق میراث اس سے ان کو محروم کیا جاتا ہے، جن لوگوں نے لڑکیوں کا حق میراث نہیں ادا کیا ہے ان پر لازم اور ضروری ہے کہ ان کا حق ضرور ادا کریں، اس میں ذرا بھی غفلت اور کوتاہی نہ کریں، دنیا میں ہر صاحب حق کا حق ادا کرکے معاملہ صاف کرلینا چاہیئے، آخرت کا معاملہ بہت ہی سنگین ہے وہاں حقوق کی ادائیگی نیکیوں سے کرائی جائے گی، نیکیاں نہ رہیں گی تو صاحب حق کے گناہ اس کے اوپر ڈال دیے جائیں گے، حدیث شریف میں ہے: **عن ابی هريرة رضی الله عنه قال قال رسول الله ﷺ من كانت له مظلمة لأخيه من عرضه أو شيء فليتحلله منه اليوم قبل أن لا يكون دينار ولا درهم وإن كان له عمل صالح**

أخذ منه بقدر مظلمة وان لم يكن له حسنات أخذ من سيئات صاحبه فحمل عليه (بخاری شریف ج ا ص ۳۳۱)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس پر اس کے بھائی کا کوئی حق اس کی آبرو ریزی یا مال سے متعلق ہو تو اسے چاہئے کہ آج ہی اس سے معافی حاصل کرلے اس سے پہلے کہ (قیامت کا دن آئے) وہاں اس کے پاس نہ دینار ہوں گے نہ درہم، اگر اس کے پاس نیکیاں ہوں گی تو نیکیاں لے لی جائیں گی اور اگر اس کے پاس نیکیاں نہ ہوں گی تو صاحب حق کے گناہ اس پر ڈال دئے جائیں گے۔

بخاری شریف میں ہے کہ ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن کا جھگڑا تھا کچھ لوگوں سے ایک زمین کے بارے میں، تو وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس گئے اور اس کو بیان کیا تو حضرت عائشہ نے فرمایا اے ابو سلمہ زمین سے بچئے اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو آدمی کسی کی ایک بالشت زمین بھی ظلماً لے لے تو اسے سات زمینوں کا طوق پہنایا جائے گا۔

دوسری روایت میں ہے کہ جو کسی کی زمین کا تھوڑا حصہ بھی ناحق لے لے تو اسے قیامت کے دن سات زمینوں تک دھنسایا جائے گا: عن ابی سلمة بن عبدالرحمن وكانت بينه وبين اناس خصومة فى أرض فدخل علىٰ عائشة فذكر لها ذٰلك فقالت يا أباسلمة اجتنب الأرض فإن رسول اللّٰه ﷺ قال: من ظلم قيد شبر من الأرض طوقه من سبع أرضين. عن سالم عن أبيه قال قال النبى ﷺ: من أخذ شيئاً من الأرض بغير حقه خسف به يوم القيامة إلى سبع أرضين. (بخاری شریف ج ا ص ۴۵۳) يعلى بن مرة الثقفى يقول سمعت رسول اللّٰه ﷺ يقول: من أخذ أرضاً بغير حق كلف أن يحمل ترابها إلى المحشر. (مسند احمد ج ۲۹ ص ۹۹ حدیث ۱۷۵۵۸)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے کسی کی زمین ناحق لیا اس پر حشر میں اس زمین کی مٹی لاد دی جائے گی۔

عن يعلى بن مرة قال سمعت النبى ﷺ يقول ايما رجل ظلم شبراً من الأرض كلفه اللّٰه أن يحفره حتىٰ يبلغ أخر سبع أرضين ثم يطوقه إلى يوم القيامة

حتی یقضی بین الناس. (مسند احمد: ج۲۹ص۱۱۱حدیث۱۷۵۷۱)

رسول اللہ ﷺ نے ارشادفرمایا کہ جس شخص نے کسی کی زمین ظلماً ایک بالشت لی اللہ تعالیٰ اس کواس کی تکلیف دیں گے کہ وہ اس کو سات زمینوں کے اخیر تک کھودے پھر قیامت کے دن لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے تک اس کواس کا طوق پہنائیں گے۔

عن جابر بن عبداللّٰہ رضی اللّٰہ عنہ ان رسول اللّٰہ قال: اتقوا الظلم فإن الظلم ظلمات یوم القیٰمۃ واتقوا الشح فان الشح أھلک من کان قبلکم حملھم علیٰ ان سفکوا دمائھم واستحلوا محارمھم۔ (مسلم شریف ج۲ص۳۲۰)

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشادفرمایا کہ ظلم سے بچو کیونکہ ظلم قیامت کے دن بہت سی ظلمتوں کا باعث ہوگا اور حرص سے بچو کیونکہ حرص نے پہلی امتوں کو ہلاک کیا، حرص نے انھیں خون بہانے اورمحارم کوحلال سمجھنے پر برانگیختہ کیا۔

قرآن کریم میں ہے، **وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلاً لَّمًّا وَتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا** (سورۃ والفجر) اور میراث کا مال سارا سمیٹ کرکھا جاتے ہو اور مال سے بہت ہی محبت رکھتے ہو۔ یہ کفار کی بری خصلت کا بیان ہے کہ تم میراث کا مال حلال وحرام سب کوجمع کر کے کھا جاتے ہو، اپنے حصے کے ساتھ دوسروں کا حصہ بھی غصب کر لیتے ہو۔ یہاں خصوصیت سے میراث کے مال کا ذکر کیا گیا حالانکہ ہرایک مال جس میں حلال وحرام کوجمع کیا گیا ہوناجائز ہی ہے، وجہ خصوصیت کی شاید یہ ہو کہ میراث کے مال پر زیادہ نظر رکھنا اوراس کے درپے ہونا بڑی کم ہمتی ہے اورکم حوصلہ ہونے کی دلیل ہے کہ مردار خور جانوروں کی طرح تکتے رہیں کہ کب ہمارا مورث مرے اور کب ہمیں یہ مال تقسیم کرنے کا موقع ہاتھ آئے، اولوالعزم اور باہمت لوگ اپنی کمائی پرخوش ہوتے ہیں مردوں کے مال پرایسی حریصانہ نظر نہیں ڈالتے۔ (معارف القرآن ج۸ص۷۴۲-۷۴۳)

اس آیت کے بعد قیامت کی ہولناکیوں کا ذکر ہے کہ ان کو یاد کرکے ایسے جرائم سے باز آجاؤ، ہم پرلازم اورضروری ہے کہ میراث کومورث کے مرنے کےفوراًبعد سارے وارثوں کواللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے طریقے پرحصہ تقسیم کرکے دیدیا جائے بلاوجہ اس میں تاخیر نہ کیا جائے۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشادفرمایا اللہ تعالیٰ کی کتاب کے مطابق حصہ داروں کے درمیان مال

تقسیم کردوقال رسول اللّٰہ ﷺ **اقسموا المال بين أهل الفرائض على كتاب الله تعالىٰ.** (مسلم شریف: ج۲ص۳۴)

مسلمانوں میں کثیر تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو دنیائے فانی کی محبت میں پھنس کر تقسیم وراثت کے شرعی اصول پر عمل کرنے سے گریز کرتے ہیں، پھر اگر خود کو گنہگار سمجھتے ہوئے انحراف کیا تو یہ فسق اور گناہ عظیم ہے اور اگر خدانخواستہ قرآنی قانون سے انکار یا اس سے نفرت اور استخفاف تک نوبت پہنچ گئی تو یہ صریح کفر ہے، دنیا کے چند روزہ عیش وعشرت کی خاطر آخرت کی دائمی نعمت سے محروم ہو جانا اور عذاب جہنم کو اختیار کرنا اور زمانہ حال کے منافع کے پیش نظر مستقبل کو برباد کر لینا اور دنیائے فانی کی تحصیل میں اپنے خالق، مالک، احکم الحاکمین اور محبوب حقیقی کو ناراض کرنا اور اس کے قہر وعذاب اور جہنم کی دہکتی ہوئی آگ پر جرأت کرنا کتنی بڑی حماقت، کوتاہ نظری اور ناعاقبت اندیشی ہے، اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اس سے محفوظ رکھیں۔ بعض مواضع میں یہ دستور ہے کہ بیوہ اگر دوسرا نکاح کرے تو اسے میراث سے محروم کر دیتے ہیں، اس لیے وہ بیچاری اپنا حصہ میراث محفوظ رکھنے کی خاطر دوسرا نکاح نہیں کرتی اور عمر بھر بیوگی کے مصائب برداشت کرنے کے ساتھ ساتھ مرحوم شوہر کے اعزہ واقرباء کے لیے شب وروز طرح طرح کے مظالم کا تختۂ مشق بنی رہتی ہے۔ سندھ میں یہ رواج بھی ہے کہ جو عورت شوہر کے قبیلہ سے نہ ہو اسے حصہ میراث نہیں دیتے، یہ بھی بہت بڑا ظلم اور جہالت ہے، بیوی کا حصہ قرآن کریم نے بہر حال فرض کیا ہے خواہ وہ شوہر کے خاندان سے ہو یا کسی دوسرے خاندان سے۔ یہ جرم تو اکثر دیندار اور اہل علم گھرانوں میں پایا جاتا ہے کہ بہنوں سے حصہ میراث معاف کروا لیتے ہیں مگر خوب سمجھ لیں اور یاد رکھیں کہ بہنوں کے معاف کرنے سے آپ ہرگز بری الذمہ نہیں ہو سکتے، اولاً تو اس لیے کہ بہنیں جاہلیت کے رواج کے مطابق حصہ میراث طلب کرنے کو بہت معیوب سمجھتی ہیں اور بھائیوں کی ناراضی اور لوگوں کے طعن وتشنیع سے ڈرتی ہیں، کافرانہ رواج نے ظلم عظیم کے ساتھ ساتھ ان مظلوم عورتوں کی زبان بھی بند کر رکھی ہے، اللہ کے لیے ان بے زبان مظلوم عورتوں کی آہ سے ڈریئے اور اپنے حال پر رحم کھایئے، نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: **اتق دعوة المظلوم فإنه ليس بينه وبين الله حجاب.** (بخاری شریف ج۱ص۳۳۱)

مظلوم کی بددعا سے ڈرو کیونکہ اس کے اور اللہ کے درمیان کسی قسم کا کوئی حجاب نہیں یعنی بہت

جلد قبول ہوتی ہے، غرضیکہ اولاً تو ان کا بادل ناخواستہ محض زبان سے معاف کرنا ہی شرعاً معتبر نہیں۔ ثانیاً اگر شاذ ونادر کوئی عورت بشرح صدر وطیب خاطر بھی معاف کر دے تو بھی یہ معاف کرنا اور کرانا گناہ سے خالی نہیں، کیونکہ اس میں خلاف شرع ہندوؤں کی ظالمانہ رسم کی ترویج وتائید ہوتی ہے جو گناہ کبیرہ ہے۔ ثالثاً یہ معاف کرنا شرعی اصول کے خلاف ہے اس لیے کہ حق معاف کرنا یا چھوڑنا یا ساقط کرنا یا بری کرنا یا بخش دینا وغیرہ الفاظ سے صرف قرض معاف ہوتا ہے، ان الفاظ سے متعین چیز کی تملیک نہیں ہوتی، متعین چیز کی تملیک کے لیے ہبہ، عطیہ، ہدیہ یا دینا وغیرہ کے الفاظ موضوع ہیں مگر ترکہ میں ان الفاظ سے بھی تملیک نہیں ہوتی، کیونکہ ایسی مشترک چیز جو تقسیم کے بعد بھی قابل انتفاع رہے اس کا ہبہ شرعاً صحیح نہیں، بعض کہتے ہیں کہ وقتاً فوقتاً عید وغیرہ کے مواقع پر بہنوں کو جو ہدایا دینے کا دستور ہے وہ اس کے عوض میں اپنا حصہ میراث بھائیوں کو دیتی ہیں، یہ خیال بھی غلط ہے اس لیے کہ اس بیع پر بہنوں کی رضامندی نہیں پائی جاتی بلکہ وہ رواج کے مطابق مجبور ہیں، نیز مختلف مواقع پر دیئے جانے والے ہدایا کی مقدار اور جنس اور مالیت مجہول ہے، لہٰذا یہ بیع صحیح نہیں، غرضیکہ حرام کو حلال بنانے اور بے زبان مظلوم بہنوں کا حصہ میراث ہضم کرنے کے لیے جو چالیں بھی چلی جاتی ہیں وہ سب شرعاً مردود اور باطل ہیں، میت کی یادگار کے طور پر کسی چیز کو معمولی سمجھ کر یا متبرک سمجھ کر بعض وارث ترکہ میں سے بعض اشیاء پر بدون اطلاع یا بدون رضا دوسرے وارثوں کے قبضہ کر لیتے ہیں، یہ بھی حرام اور گناہ کبیرہ ہے جو حق العبد ہونے کی وجہ سے توبہ سے بھی معاف نہیں ہوتا خواہ وہ ادنیٰ سی چیز ہی کیوں نہ ہو، پھر اگر وارثوں میں کوئی نابالغ بھی ہے تو اس سے معاف کروانے پر بھی معاف نہ ہوگا جب تک وہ بالغ نہ ہو جائے اس کا معاف کرنا شرعاً معتبر نہیں، پس اگر اس کے بلوغ سے قبل ہی وہ یا یہ چل بسا تو عذاب آخرت سر پر رہا اعاذنا اللہ منہ، ایسا تبرک حاصل کر کے عذاب جہنم اختیار کرنا کتنی بڑی حماقت اور ناعاقبت اندیشی ہے، البتہ اگر سب وارث عاقل وبالغ ہوں اور سب کی طیب خاطر سے رضامندی کا پورا یقین ہو تو کچھ حرج نہیں، مجنوں اور نابالغ کی رضا کا اعتبار نہیں، بہرکیف اس سے احتراز ہی بہتر ہے، اس لیے کہ سب وارثوں کی رضا کا یقین مشکل ہے، نیز اپنے نفس کو دوسروں پر ترجیح دینا اور کچھ طلب کرنا مروت اور جذبہ ایثار کے خلاف ہے، لہٰذا اس کا صحیح طریقہ یہی ہے کہ ہر چیز سب وارثوں پر بقدر حصہ تقسیم کی جائے، اگر کوئی چیز ناقابل تقسیم ہو تو اسے کوئی ایک وارث خریدے اور اس کی قیمت

سب پر بقدر حصہ تقسیم کی جائے اگر کسی چیز میں سب وارثوں کو رغبت ہو تو اسے آپس میں نیلام کرلیں جو زیادہ قیمت دے اس کو دیدی جائے۔ (احسن الفتاویٰ ج۹ ص۳۴۵ تا ۳۴۸)

کسی کا مال دبالینے اور میراث نہ دینے پر بسا اوقات خاندان میں نااتفاقی پیدا ہوجاتی ہے اور یہ قطع رحمی کا سبب بن جاتا ہے قطع رحمی بھی سخت گناہ کبیرہ ہے قرآن وحدیث میں اس پر بڑی سخت وعیدیں وارد ہوئی ہیں قرآن کریم میں ہے: وَیَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَاللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ یُّوْصَلَ وَیُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ ۙ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ ○ (سورہ رعد)

اور قطع کرتے ہیں اس چیز کو جس کو فرمایا اللہ تعالیٰ نے جوڑنا اور فساد اٹھاتے ہیں ملک میں ایسے لوگوں پر لعنت ہوگی اور ان کے لیے ہے برا گھر یعنی جہنم۔ رشتہ داری کے وہ تعلقات بھی اس میں شامل ہیں جن کو قائم رکھنے اور ان کے حقوق ادا کرنے کی قرآن کریم میں جابجا ہدایت کی گئی ہے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنے والے ان حقوق وتعلقات کو بھی توڑ ڈالتے ہیں مثلاً ماں، باپ، بھائی، بہن، پڑوسی اور دوسرے متعلقین کے جو حقوق اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے انسان پر عائد کیے ہیں یہ لوگ ان کو ادا نہیں کرتے۔ (معارف القرآن ج۵ ص۱۹۶، ۱۹۷)

اسی طرح ترکہ تقسیم کرنے سے پہلے میت کے یہاں دعوت کھانے کو بھی فقہاء نے ناجائز لکھا ہے خاص طور سے جب کہ ورثاء میں نابالغ ہوں، (مستفاد فتاویٰ محمودیہ ج۱۸ ص۱۳۹) **ویکره اتخاذ الضيافة فى ايام المصيبة............ فان كان فى الورثة صغير لم يتخذوا ذٰلك من التركة.** (فتاویٰ قاضی خاں ج۳ ص۳۰۶ دارالکتب العلمیۃ)

اسی طرح ترکہ تقسیم کرنے سے پہلے میت کے مال سے اس کے لیے ایصال ثواب میں مال خرچ کرنا چاہے وہ قرآن خوانی کے بعد کھانا کھلانا یا مٹھائی وغیرہ کھلانا یا صدقہ کرنا یا مسجد مدرسہ میں خرچ کرنا وغیرہ سب ناجائز ہے، اس سے بچنا لازم ہے، **ويكره اتخاذ الضيافة من الطعام من أهل الميت لانه شرع فى السرور لا فى الشرور وهى بدعة مستقبحة .... ولا سيما اذا كان فى الورثة صغار أو غائب.** (شامی ج۳ ص۱۴۸-۱۴۹)(مستفاد فتاویٰ محمودیہ ج۲۰ ص۳۲۱)

بقیہ صفحہ ۵ پر

مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی اور رسالہ معارف

از: ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی پروفیسر شعبۂ اردو
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ماہ نامہ معارف بلاشبہہ علوم ومعارف کا گنجینہ ہے۔ اردو رسائل وجرائد کے درمیان اس کا یہ امتیاز بھی لائقِ صد افتخار ہے کہ اس نے اپنی زندگی کے سوسال پورے کرلیے ہیں۔ معارف صدی کی مناسبت سے یہ دوروزہ سیمینار بھی اپنے طرز کا ایک منفرد سیمینار ہے۔

معارف کے امتیاز کے بہت سے پہلو ہیں۔ ازانجملہ اس کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ اپنے لائق وفائق مدیر سید سلیمان ندوی اور دیگر نامور رفقائے دارالمصنفین کے گراں ارز مضامین ومقالات کی وجہ سے اس نے علمی وادبی حلقوں کو بہت جلد اپنی جانب متوجہ کرلیا تھا۔ اہلِ علم بہ طورِ خاص اس کا مطالعہ کرتے اور اس کی فائلیں محفوظ رکھتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی اس میں مضامین ومقالات لکھ کر اپنی اور رسالے کی توقیر میں اضافہ بھی کرتے رہتے تھے۔ اس ضمن میں ایک اہم اور قابلِ ذکر نام محدثِ جلیل مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی [۱۹۰۱ء۔۱۹۹۲ء] کا بھی ہے۔

مولانا اعظمی کا شمار نہ صرف ہندوستان بلکہ عالم اسلام کے علمائے کبار میں کیا جاتا ہے۔ وہ علمائے متقدمین کی طرح جامع العلوم والفنون تھے۔ بالخصوص علم حدیث اور اس کی مختلف شاخوں میں درجۂ کمال کو پہنچے ہوئے تھے۔ ان کی سیرت وشخصیت اور علمی خدمات سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے دوجلدوں پر مشتمل ڈاکٹر مسعود احمد اعظمی کی ''حیاتِ ابوالمآثر'' کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

مولانا اعظمی نے اپنی پختہ علمی استعداد، درس وتدریس کی اعلیٰ صلاحیت اور تحریر وتصنیف پر قدرت کی بناپر اپنے عہد کے اکابر علما کا اعتماد کم عمری ہی میں حاصل کرلیا تھا۔ چنانچہ ان کے مرشد ومُربّی حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اور اساتذۂ کرام میں علامہ انورشاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے حق میں کلماتِ تشجیع وتحسین ارشاد فرمائے ہیں۔ مدیر معارف مولانا

سید سلیمان ندوی کا نام نامی بھی اسی فہرست میں شامل ہے۔ وہ باوجودیکہ عمر اور علمی شہرت وعظمت میں مولانا اعظمی سے فائق وبرتر تھے، لیکن ان کی حذاقتِ علمی کے معترف ومداح تھے۔ اس لیے بہ طورِ خاص ان کے ساتھ انس ومحبت کا معاملہ فرماتے تھے۔ مولانا اعظمی بھی دارالمصنفین کے کتب خانے سے استفادے اور سید صاحب سے ملاقات ومذاکرات کے لیے وقتاً فوقتاً اعظم گڑھ جاتے رہتے تھے۔ سید صاحب کے پاکستان منتقل ہوجانے کے بعد مکتوب بنام مفتی ظفیر الدین مؤرخہ ۲۰/اگست ۱۹۵۱ء میں اظہارِ تاسف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''سید صاحب دام ظلہٗ کا تہہِ دل سے ممنون ہوں کہ مجھ کو بھولے نہیں ہیں۔ مجھ کو بھی کسی کے پاکستان چلے جانے کا کوئی رنج نہیں۔ لیکن حضرت مولانا شبیر احمد رحمۃ اللہ علیہ اور سید صاحب کے پاکستان منتقل ہوجانے کا صدمہ دل سے کبھی نہیں جاسکتا۔ پہلے جب کبھی جی گھبراتا تھا تو دن بھر کے لیے اعظم گڑھ چلا جاتا تھا۔ سید صاحب سے جی بھر کے باتیں ہوتی تھیں۔ اور سارا غم غلط ہوجاتا تھا افسوس کہ اب یہ سہارا بھی نہیں رہا۔ شاید نومبر میں ایک آدھ گھنٹے کے لیے دارالمصنفین گیا تھا، پھر جب سے آج تک نوبت نہیں آئی۔'' (حیات ابوالمآثر ۱/۵۳۳)

جہاں تک 'معارف' کا تعلق ہے تو اس میں مولانا اعظمی کا پہلا مضمون 'جوّ ادساباط' کے عنوان سے اپریل ۱۹۲۸ء میں شائع ہوا ہے۔ یہ نہایت معلومات افزا مضمون ہے۔ اس میں انھوں نے بتایا ہے کہ جوّ ادساباط ایک عرب تھے جنھوں نے ہندوستان میں تیرہویں صدی ہجری میں عیسائی مبلغین کی ملمع کاری کا پردہ چاک کیا اور ان کے منصوبوں کو خاک میں ملادیا۔ اس مضمون میں اولاً جوّ ادساباط کے سلسلۂ نسب اور خاندانی حالات تحریر کیے گئے ہیں پھر خود جوّ اد کے احوال وکوائف بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد تبلیغ مسیحیت کے مقابلے کے سلسلے میں جوّ اد کی خدمات کا مفصل بیان کیا گیا ہے۔

اس مضمون کے مطالعے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ جوّ اد نے مسیحیت کے مقابلے کے لیے یہ تدبیر اختیار کی کہ ظاہری طور پر اسلام چھوڑ کر مسیحیت میں داخل ہوگئے اور پھر خود کو انجیل کا عربی ترجمہ کرنے پر مامور کرالیا۔ بعض معمولی وقفوں کے ساتھ وہ اس کام میں چودہ برس تک مصروف رہے۔ مگر در پردہ وہ مسیحیت کے جال کا تار وپود بکھیرتے رہے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے دو

معرکہ آرا کتابیں لکھیں۔ جن میں ایک کا نام 'الصراصر الساباطية' اور دوسری کا 'البراهين الساباطية' ہے۔ اول الذکر شائع نہ ہوسکی لیکن ثانی الذکر شائع ہوئی اور مصنف نے اسے خفیہ طور پر مفت تقسیم کرایا۔ اس کتاب کی تصنیف و اشاعت میں جوّاد کو کن کن مصائب ومشکلات کا سامنا کرنا پڑا؟ اس کی تفصیلات بھی مضمون میں پیش کی گئی ہیں۔ پورا مضمون نادر اور مفید معلومات سے پُر ہے۔ جوّاد عربی کے علاوہ فارسی اور اردو سے بھی واقف تھے۔ ان کی تصانیف کی تعداد ۳۰ تک پہنچتی ہے جن میں بیشتر عربی میں اور بعض فارسی اور اردو میں ہیں۔ حیرت ہے کہ خیر الدین زرکلی کی الأعلام جوّاد ساباط کے ذکر سے خالی ہے۔

معارف میں مولانا اعظمی کا ایک اور مضمون اگست ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا ہے۔ اس کا عنوان ہے: ''الدراية فی تخريج أحاديث الهداية کا ایک نادر نسخہ'' الدراية کے مصنف حافظ ابن حجر عسقلانی ہیں۔ ان کی یہ کتاب زیلعی کی نصب الراية کی تلخیص ہے۔

مولانا نے اپنے مضمون میں بتایا ہے کہ ان کا پیش نظر نسخہ خود مصنف کی زندگی میں اور تصنیف کے صرف تین سال بعد ۸۳۰ھ میں لکھا گیا ہے۔

اس کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس کے کاتب ابوالفتح محمد بن احمد خطیب طوخی نویں صدی ہجری کے مشہور عالم وکاتب ہیں۔ سخاوی کی 'الضوء اللامع' میں ان کا تذکرہ موجود ہے۔

اس کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ ہندوستان کے مشہور بزرگ وعالم مولانا غلام یحیٰ بہاری قدس سرہٗ کی ملک رہ چکا ہے۔

ان تمام خصوصیات سے بڑھ کر اس نادر نسخے کا امتیاز یہ ہے کہ اس پر حافظ ابن حجر کے بلند پایہ شاگرد، جلیل القدر مصنف اور نویں صدی کے مشہور حافظِ حدیث علامہ قاسم بن قطلو بغا کے تعلیقات وحواشی ثبت ہیں۔ بہ الفاظ دیگر یہ نسخہ خود علامہ قاسم کے مطالعے میں رہ چکا ہے اور اس پر خود ان کے دستِ مبارک سے تعلیقات درج ہیں۔

ان تعلیقات کی اہمیت یہ ہے کہ حافظ ابن حجر عسقلانی جیسے جلیل القدر محدث جن احادیث کی تخریج میں ناکام رہے ہیں، علامہ قاسم نے اپنی تعلیقات میں ان کی نشان دہی فرمائی ہے۔ ذیل میں اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو:

حدیث ''لا نكاح إلا بشهود'' کی نسبت حافظ ابن حجر نے فرمایا ہے: 'لم أره بهذا

اللفظ" اس پر علامہ قاسم فرماتے ہیں: "قلت أخرجه محمدبن الحسن فی الأصل بلاغاووصله الخطیب من حدیث علی۔''

مولانا اعظمی نے پیش نظر مضمون میں اس طرح کے ۱۲۹ استدراکات نقل کیے ہیں۔ اس سے اس مضمون کی افادیت نیز مولانا کے ذوقِ تحقیق کا بہ خوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ آخر میں یہ وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ مولانا نے ان استدراکات کو "تعلیقات الحافظ قاسم بن قطلوبغاعلی الدرایة " کے عنوان سے "منیة الألمعی بمافات الزیلعی" کے ساتھ ۱۹۵۰ء میں ہی مصر سے شائع کرادیا تھا۔

مولانا اعظمی کا ایک اور مضمون ''مبارق الازھار کس کی تصنیف ہے؟'' کے عنوان سے معارف، جنوری ۱۹۵۴ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ مولانا نے اس مضمون کی تمہید میں بتایا ہے کہ عبداللطیف بن ملک یا ابن فرشتہ ایک مشہور مصنف اور نامور عالم ہیں۔ ان کی تصنیفات میں مشارق الانور کی شرح مبارق الازھار کو بہت شہرت ومقبولیت حاصل ہے۔ یہ شرح استنبول سے چھپ کر شائع بھی ہوچکی ہے۔ لیکن قاضی سید نورالدین حسین نے معارف (جولائی ۱۹۴۹ء) میں اور ڈاکٹر سید باقر علی نے معارف (اکتوبر ۱۹۵۰ء) میں یہ انکشاف فرمایا ہے کہ یہ کتاب ایک ہندوستانی عالم کی تصنیف ہے جو احمد آباد کے باشندے تھے اور ان کے والد کا نام عبدالملک بنبانی تھا۔

مولانا اعظمی نے پیش نظر مضمون میں مذکورہ بالا دونوں مقالہ نگاروں پر تعقّب کیا ہے اور دلائل کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ دونوں فاضل مقالہ نگاروں کا نیا انکشاف معیار تحقیق پر پورا نہیں اترتا اور تاریخی اعتبار سے کسی طرح قابل تسلیم نہیں ہے۔ اس ضمن میں مولانا نے یہ وضاحت بھی کی ہے کہ وہ تمام مصنفین جنھوں نے ابن فرشتہ کا حال لکھا ہے یا جنھوں نے مبارق الازھار کا ذکر کیا ہے سب اس کو عبداللطیف بن الملک کی تصنیف بتاتے ہیں۔ ملاحظہ ہو الضوء اللامع، الشقائق النعمانیه، اعلام الاخیار، شذرات الذھب، فوائد بھیه، اتحاف النبلاء، کشف الظنون اور مقدمۂ شرح وقایہ وغیرہ۔ بلکہ مبارق کے مصنف نے خود اپنے نام کی تصریح اس طرح کی ہے "وبعد فیقول العبدالضعیف عبداللطیف بن عبدالعزیز المعروف بابن الملك۔" حاصلِ گفتگو کے طور پر مولانا نے بتایا ہے کہ عبداللطیف بن عبدالملک بنبانی احمد آبادی ایک دوسرے بزرگ ہیں جو مبارق الازھار کے مصنف نہیں ہیں۔

مولانا نے اپنے اس مضمون میں اصل موضوعِ بحث کے علاوہ بھی دونوں فاضل مقالہ نگاروں کی متعدد غلط فہمیوں کا ازالہ فرمایا ہے، جس سے ان کی وسعتِ مطالعہ بالخصوص طبقات وتراجم کی کتابوں پر گہری نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان سب سے قطعِ نظر مولانا کا یہ مضمون بعض ایسے اہم علمی نکات پر مشتمل ہے جنھیں خود ان کی دریافت کہنا چاہیے۔ مثلاً وہ یہ بتاتے ہیں کہ سخاوی نے الضوء اللامع میں بالعموم انھیں اعیان کا ذکر کیا ہے جنھوں نے نویں صدی ہجری میں وفات پائی ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ اس طرف بھی متوجہ کرتے ہیں کہ ہم جانتے ہیں کہ سخاوی نے اس کتاب میں بعض ایسے عالموں کا بھی ذکر کر دیا ہے جن کی وفات دسویں صدی ہجری میں ہوئی ہے مگر ان کا ذکر انھوں نے ایسے انداز میں کیا ہے کہ ہر شخص سمجھ لیتا ہے کہ جس کا ذکر کیا جارہا ہے وہ ابھی زندہ ہے۔

ظاہر ہے کہ اس نکتے کی طرف وہی متوجہ کر سکتا ہے جس نے 'الضوء اللامع' کا ایک سے زائد بار بہ نظرِ غائر اور بالاستیعاب مطالعہ کیا ہو۔ یہ محض خوش گمانی نہیں بلکہ اس ضمن میں مولانا اعظمی کی ایک تصریح بھی موجود ہے۔ ڈاکٹر مسعود احمد اعظمی 'حیاتِ ابوالمآثر' میں رقم طراز ہیں:

''اس کتاب کی پہلی جلد کے سرورق پر علامہ اعظمی کے قلم سے یہ عبارت منقوش ہے: 'طالعت هذا الكتاب كله أعني اجزاء ه الاثنى عشر قبل اليوم بسنوات مستعيرا إياه من مكتبة دارالمصنفين ثم لمااشتريته لمفتاح العلوم شرعت فى قراء ته ثانيا سنة ۱۳۶۹ھ۔'' (۴۸۶/۱)

مولانا اعظمی کا ایک اور مضمون ''پورب کی چند برگزیدہ ہستیاں'' ہے۔ یہ معارف میں دو قسطوں میں اکتوبر، نومبر ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا ہے۔ اس مضمون کی تمہید میں مولانا رقم طراز ہیں:

''پورب کے خطے میں جو اولیائے کرام آسودۂ خاک ہیں اور ان کو شہرت دوام وقبول عام حاصل ہے، ان میں ایک برگزیدہ ہستی حضرت شاہ طیب بنارسی قدس سرہٗ کی ہے۔ ایک عرصے سے مجھے حضرت موصوف کے تفصیلی حالات معلوم کرنے کا شوق تھا اور اس شوق میں مجھے "مناقب العارفين" کی تلاش وجستجو تھی جس کو ان کے حالات میں ان کے صاحبزادے شاہ محمد یسین قدس سرہٗ نے تصنیف فرمایا ہے۔ خوش قسمتی سے بنارس میں اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ دستیاب ہوا اور میں اس کے مطالعے سے بہرہ ور ہوا۔

مجھے اس کتاب میں اچھا خاصا تاریخی وعلمی مواد نظر آیا۔ اس لیے میں نے اردو میں اس

کا خلاصہ قلم بند کرلیا اور آج اسی خلاصے کو ناظرین معارف کے سامنے پیش کررہا ہوں۔''

اس طویل مضمون میں شاہ طیب بنارسی کے علاوہ جن دیگر بزرگوں کے احوال قلم بند کیے گئے ہیں، ان میں سے چند کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں:

شاہ محمد یسین، شیخ تاج الدین جھونسوی، مولانا خواجہ کلاں، شیخ نصیرالدین ،شاہ حسن داوٗد بنارسی، شیخ فرید بنارسی، خواجہ مبارک بنارسی، مخدوم محمد عیسیٰ تاج جون پوری۔

مولانا اعظمی کا پیش نظر مضمون اگرچہ 'مناقب العارفین' فارسی کا اردو خلاصہ ہے، لیکن اس کی اہمیت یہ ہے کہ تادمِ تحریر اصل فارسی قلمی کتاب 'مناقب العارفین' زیورطبع سے آراستہ نہیں ہوسکی ہے۔ اس کا صرف ایک ہی نسخہ دستیاب تھا جو جامعہ مظہرالعلوم، کچی باغ، بنارس کے کتب خانے کی زینت تھا۔ راقم حروف نے ۲۰۔۲۲ سال قبل اس کی زیارت کی تھی۔ موجودہ صورتِ حال کا علم نہیں۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مولانا نے اپنے اس مضمون پر خود ہی استدراک بھی تحریر فرمایا تھا جو معارف میں جنوری ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا۔ اس میں انھوں نے اپنی بعض فروگذاشتوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے ان کی اصلاح فرمائی ہے۔ اس سے مولانا کی احتیاط پسند طبیعت اور تحقیقی مزاج کا اندازہ ہوتا ہے۔

مولانا اعظمی کا ایک اور معرکہ آرا مضمون ہے ''الذخائر والتحف کس کی تصنیف ہے؟'' یہ معارف میں فروری ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا ہے۔ یہ نہایت محققانہ مضمون ہے جو دو اہل علم ڈاکٹر حمیداللہ اور قاضی اطہر مبارک پوری کے درمیان اختلاف رائے کے بعد محاکمے کے طور پر تحریر کیا گیا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ "الذخائر والتحف" جب ڈاکٹر حمیداللہ کے مقدمے کے ساتھ شائع ہوئی تو انھوں نے اس کے مصنف قاضی الرشید بن الزبیر کی نسبت مقدمے میں لکھا کہ ان کا حال ہم کو کسی کتاب میں نہیں ملا، مگر کتاب کی اندرونی شہادتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ پانچویں صدی ہجری کے ایک عالم تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی اس رائے سے اختلاف کرتے ہوئے قاضی اطہر مبارک پوری نے معارف دسمبر ۱۹۶۰ء میں اپنی یہ تحقیق پیش کی کہ قاضی الرشید بن الزبیر کا تفصیلی ذکر تاریخ ابن خلکان میں موجود ہے اور وہ پانچویں نہیں، چھٹی صدی کے ایک جامع الفنون عالم تھے۔ قاضی صاحب کے مضمون کی اشاعت کے بعد بھی ڈاکٹر حمیداللہ کی رائے یہی رہی کہ الذخائر والتحف کے مصنف پانچویں صدی ہجر کے ہی کوئی عالم تھے۔

مولانا اعظمی نے اپنے محاکمے میں اولاً یہ بتایا ہے کہ قاضی الرشید بن الزبیر جن تین شخصیتوں کا لقب بتایا گیا ہے وہ تینوں معروف ہیں۔ایک تو وہی ابن خلکان والے القاضی الرشید، ان کا نام احمد ہے۔دوسرے ان کے والد علی ہیں اور تیسرے ان کے دادا ابراہیم ہیں۔اس کے بعد مولانا نے یہ بتایا ہے کہ والد اور دادا ان دونوں کا تذکرہ ہمارے دونوں فاضلوں کو نہیں مل سکا ہے، حالانکہ ان دونوں کا ذکر "الطالع السعید"مطبوعہ مصر ۱۳۳۳ھ میں موجود ہے۔علی کی نسبت یہ مذکور ہے کہ وہ فاضل، شاعر اور رئیس تھے اور ان کی وفات ۵۲۵ھ میں ہوئی ہے۔اور ابراہیم کی نسبت یہ مرقوم ہے کہ وہ ۴۷۳ھ میں اضلاع قوص کے حاکم تھے۔رشید ومہذب ان کے پوتے تھے۔اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ احمد اور علی کا زمانہ چھٹی صدی ہے اور ابراہیم کا زمانہ پانچویں صدی ہے۔

مضمون کے اگلے حصے میں مولانا نے اُن دلائل کا جائزہ لیا ہے جن کی بنا پر ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے الذخائر والتحف کی تصنیف کا زمانہ پانچویں صدی ہجری قرار دیا ہے۔پھر اخیر میں محاکمہ کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ:

> ''ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے دلائل کا جائزہ لینے کے بعد ہمارے نزدیک ان ہی کی رائے قرین صواب معلوم ہوتی ہے اور ہمارا رجحان بھی اسی طرف ہے کہ 'الذخائر والتحف' ابن خلکان والے القاضی الرشید کی تصنیف نہیں ہے، بلکہ وہ ان کے دادا القاضی الرشید ابراہیم کی تصنیف ہے۔''

مولانا اعظمی نے اس مضمون میں بھی حسب معمول اصل بحث سے قطع نظر متعدد اضافی معلومات بہم پہنچائی ہیں نیز مختلف غلط فہمیوں کا ازالہ بھی فرمایا ہے۔

اب راقم حروف یہ عرض کرنا چاہتا ہے کہ جناب سہیل شفیق کے مرتبہ ''اشاریہ معارف اعظم گڑھ'' سے حاصل شدہ معلومات کے پیش نظر میرا خیال تھا کہ معارف میں مولانا اعظمی کے یہی پانچ مقالات شائع ہوئے ہیں جن کا تعارف گذشتہ صفحات میں پیش کیا گیا۔لیکن بعد میں حیات ابوالمآثر جلد اول سے مراجعت کے بعد معلوم ہوا کہ معارف میں مولانا اعظمی کی کچھ اور تحریریں بھی شائع ہوئی ہیں جن کی فہرست درج ذیل ہے:

۱- دو متبرک اجازت نامے	دسمبر	۱۹۳۷ء
۲- تخریج زیلعی	جولائی	۱۹۴۰ء

۳- دِینَوَر اور مشائخِ دینور — اکتوبر ۱۹۶۵ء

۴- ابوعبید کی غریب الحدیث — اکتوبر ۱۹۶۷ء

۵- غریب الحدیث — فروری ۱۹۶۸ء

۶- فہرست مخطوطاتِ پنجاب یونیورسٹی، لاہور — اپریل ۱۹۷۹ء

افسوس ہے کہ وقت کی قلت اور پیش نظر مضمون کی طوالت کی وجہ سے ان سب مضامین ومقالات کا تفصیلی تعارف سرِ دست ممکن نہیں۔ البتہ اپنے چند تاثرات کا پیش کرنا یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(الف) مولانا اعظمی ماہ نامہ معارف کے مستقل اور صاحب نظر قاری تھے اور بالعموم اس میں شائع ہونے والی تحریروں کو وہ بہ غور پڑھتے تھے اور جب کبھی کسی مقالہ نگار کی اصلاح وتصویب کی ضرورت محسوس کرتے تھے تو اسے متنبہ فرما دیتے تھے اور اس ضمن میں بہت سی نئی اور مفید معلومات بھی پیش کر دیتے تھے۔ فنونِ حدیث اور کتبِ طبقات وتراجم سے متعلق ان کا مطالعہ نہایت وسیع تھا۔ تحقیق منسوبات سے بھی انھیں دلچسپی تھی۔ ان موضوعات سے متعلق ان کے استدراکات نہایت وقیع اور محققانہ ہیں۔

(ب) مولانا کے مضامین ومقالات کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی ہر بحث اور ہر گفتگو میں حسنِ ترتیب کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ ان کے مقالے کے اجزا میں بہ نظرِ غائر بھی تقدیم وتاخیر کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔

(ج) مولانا اپنی تحریروں میں ایجاز بیانی اور لفظی کفایت شعاری کا بھی شعوری طور پر اہتمام فرماتے ہیں۔ اس لیے ان کے یہاں آرائشی جملے اور فقرے یا غیر ضروری مرادفات نظر نہیں آتے۔

مولانا اعظمی کا سانحۂ وفات ۱۱رمضان المبارک ۱۴۱۲ھ مطابق ۱۶مارچ ۱۹۹۲ء کو پیش آیا۔ اپریل ۱۹۹۲ء کے معارف میں مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے ''محدث العصر مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی'' کے عنوان سے مبسوط تعزیتی مضمون تحریر فرمایا۔ موقع ومحل کی مناسبت سے یہاں اس کا ایک مختصر اقتباس نقل کیا جاتا ہے۔ لکھتے ہیں:

''مولانا سلیس، شگفتہ، پُر مغز اور حشو وزوائد سے پاک اردو لکھتے تھے جو ماقلّ ومادلّ کا نمونہ

ہوتی تھی۔ مستقل کتابوں کے علاوہ انھوں نے معارف اور برہان میں متعدد محققانہ مضامین بھی لکھے ہیں۔ ان میں سے اکثر میں کسی مصنف یا مقالہ نگار کی فروگذاشتوں کی نشان دہی کی گئی ہے۔ اور یہ بڑے بیش قیمت ہیں جن سے علمی و تحقیقی کام کرنے والے بے نیاز نہیں ہوسکتے۔''

انھیں معروضات پر اس گفتگو کو ختم کیا جاتا ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ اسے تحسینِ ناشناس پر محمول نہیں کیا جائے گا۔

☆-☆☆-☆☆-☆

☆-☆☆-☆

☆-☆-☆

صفحہ ۵۹ کا بقیہ

دیکھیے! میں بتاتا ہوں کہ آج ہماری تذکیر میں بھی نقص ہے، صحیح معنوں میں اور صحیح طریقہ سے نہیں ہورہی ہے اس لیے نفع نہیں دے رہی ہے، آپ جلسوں میں جاکر دیکھ لیجئے کہ کیا ہوتا ہے کہ ایک مقرر تقریر کرنے کھڑا ہوتا ہے، گھنٹہ دو گھنٹہ بھر لوگ سنتے سنتے جب بھاگنے لگتے ہیں تو مقرر صاحب کہتے ہیں! بس دس منٹ میں ختم کرتا ہوں، پھر انھوں نے دس کا بیس منٹ لیا، پھر لوگ بھاگنے لگے تو کہتے ہیں! بس اب ختم ہی کرتا ہوں، دعا سن کے چلے جایئے۔

بہر حال میں یہ کہتا ہوں کہ یہ نبوی طریقہ نہیں ہے اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ تو اسی قدر پلاتے تھے جتنا آسانی سے پی سکیں، زبردستی نہیں تھی اور اسی معمول کو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بھی اپنایا تھا، چنانچہ صاف فرمادیا کہ جی نہیں! وعظ وتذکیر میں آنحضرت ﷺ کا جو معمول تھا وہی طریقہ ہم کو اختیار کرنا چاہئے اور دیکھ لیجئے کہ اس کا کیا اثر تھا اور آج ہم نے جو طریقہ اختیار کر رکھا ہے اس کا کیا اثر ہے۔

بس اب میں اپنی بات ختم کرتا ہوں، آپ کو بھی شدید انتظار ہوگا، اس لیے اب میں حضرت مولانا دامت برکاتہم سے درخواست کروں گا کہ وہ اپنے مواعظ حسنہ سے آپ کو مستفیض فرمائیں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العلمین

وعظ کیسا ہونا چاہیے؟

[یہ حضرت محدث الاعظمی رحمۃ اللہ کا ایک جامع اور سبق آموز بیان ہے، جو ۱۹۷۶ء میں معروف بزرگ حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڈھی رحمۃ اللہ کی مئو تشریف آوری کے موقع پر کیا گیا ہے، اور حضرت پرتاب گڈھی کی سوانح حیات مرتبہ مولانا محمد عمار صاحب الہ آبادی میں درج کیا گیا ہے، مذکورہ کتاب میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے بیان سے پہلے بطور تمہید کے مختلف واقعات ذکر کیے گئے ہیں، جو اس بیان کو سمجھنے میں مددگار ہیں، حضرت کی تقریر سے پہلے بعض واقعات یا تمہید بھی اس جگہ نقل کی جارہی ہے، جو فائدہ سے خالی نہیں ہے، ان تمہیدوں کے بعد حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا وعظ درج کیا جارہا ہے جو کتاب کے اندر ''تعارف'' کے عنوان سے ہے مگر یہاں اس کا عنوان بدل کر ''وعظ کیسا ہونا چاہیئے'' کردیا گیا ہے، (ادارہ)]

محدثِ دوراں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی نور اللہ مرقدہٗ کی گھوسی تشریف آوری:

حضرت مولانا اعظمی صاحب دامت برکاتہم نے حاجی انصار صاحب وغیرہ سے یہ فرما رکھا تھا کہ حضرت مولانا اگر منظور فرمائیں تو مئو میں ریل سے اتر کر شب میں میرے ہی مکان پر آرام فرمائیں پھر فجر کے بعد خود حضرت والا کو ساتھ لے کر گھوسی چلوں گا۔ اور اگر مولانا سیدھے گھوسی تشریف لے جائیں تو ان کو وہاں پہنچا کر وہی کار واپس کردی جائے، اس سے میں آکر حضرت سے وہیں ملاقات کروں گا۔ لیکن ریل سے اترنے کے بعد مئو میں اس کا کوئی تذکرہ نہیں ہوا، اس لیے حضرت والا سیدھے گھوسی پہنچ گئے، پھر فوراً دوبارہ مئو کار بھیج دی گئی اور علی الصباح حضرت مولانا اعظمی دامت برکاتہم اپنے دونوں صاحب زادگان کے ہمراہ گھوسی تشریف لائے۔ حالانکہ مولانا اعظمی پر دو تین روز قبل لؤ کا حملہ ہو چکا تھا اور اسی شب میں شدید لرزے کے ساتھ بخار بھی آگیا تھا۔ مگر حضرت اقدس کی محبت اور شوقِ ملاقات میں بخار کی حالت ہی میں گھوسی پہنچ گئے اور دونوں حضرات نے ایک

دوسرے سے بڑے ہی والہانہ انداز میں معانقہ کیا۔ اور اس میں شک نہیں کہ بخار کے باوجود جب کہ مکان کے اندر بھی نقل وحرکت میں تکلف ہوتا ہے، سفر کر کے مئو سے گھوسی تشریف لانا کمالِ محبت اور غایتِ تعلق کی دلیل ہے، اس کی قدر تو اہل محبت ہی جانتے ہیں۔ چنانچہ حضرت اقدس نے بھی جو بقول حضرت پھول پوری قدس سرہ 'صرف محبت ہی ہیں' اس محبت کے انداز پر بہت ہی فرحت ومسرت کا اظہار فرمایا۔ دیر تک گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ اثنائے مجلس میں ایک ڈاکٹر صاحب تشریف لائے تو مولانا اعظمی مدظلہ نے ان کا تعارف کرایا پھر ڈاکٹر صاحب کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ:

''حضرت مولانا اس وقت ہندوستان کے ممتاز ترین مشائخ میں سے ہیں۔''

ظاہر ہے کہ حضرت مولانا اعظمی مدظلہ نے حضرت کے بارے میں جو کچھ ارشاد فرمایا یہ انھیں کا مقام ہے اور واقعی انھیں کو اس کا حق بھی حاصل ہے اس لیے کہ: ع

قدرِ گوہر شاہ داند یا بداند جوہری

اور سچ پوچھیے تو حضرت اقدس دامت برکاتہم کے اس سفر کا اصل محرک مولانا ہی کی محبت اور کشش ہوئی جو پیرانہ سالی اور ضعف وعلالت کے باوجود حضرت کو الہ آباد سے کھینچ کر گھوسی لے گئی۔ الغرض یہ مجلسِ ملاقات کافی دیر تک رہی اور اخیر میں مولانا اعظمی مدظلہ نے فرمایا کہ:

''حضرت! میں اپنی بیماری کی وجہ سے قابلِ سفر نہیں تھا، اسی بنا پر جلسہ میں شرکت سے معذرت کر چکا ہوں، صرف آپ سے ملاقات کی غرض سے حاضر ہوا ہوں اور میری یہ خواہش ہے کہ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد آپ مئو تشریف لے چلیں اور کم از کم ایک روز میرے وہاں قیام فرمائیں تاکہ اطمینانی ملاقات ہو سکے۔''

حضرت اقدس نے بہ طیبِ خاطر اس کو منظور فرمایا۔ اس کے بعد حضرت مولانا اعظمی اپنے رفقاء کے ہمراہ تشریف لے گئے۔

اسی روز ہمارے غریب خانہ محلّہ ملک پورہ قصبہ گھوسی بھی تشریف لے گئے اور وہاں دعا فرمائی، مسجد ومدرسہ ناصر العلوم کو بھی مشرف فرمایا۔

حضرت اقدس، حضرت مولانا اعظمی کے دولت کدہ پر

دوسرے روز ۱۲ر مئی ۱۹۷۶ء کو حسبِ وعدہ حضرت مولانا اعظمی دامت برکاتہم کے دولت کدہ

پر مئو ناتھ بھنجن تشریف لے گئے۔ اور وہاں پہنچ کر چائے کے بعد تھوڑی دیر کے لیے دار العلوم میں بھی تشریف لے گئے۔ وہاں پر حضرت مولانا عبدالحق صاحب مدظلہ صدر مدرس اور ناظم مدرسہ، نیز دیگر حضرات نے دار العلوم میں بیان کی درخواست کی، اُدھر جائے قیام پر بھی بیان کے لیے اہل محلّہ خواہش مند اور مصر تھے، پھر اسی شب میں حضرت کی الٰہ آباد واپسی بھی طے تھی۔ حضرت مولانا اعظمی دامت برکاتہم سے استصوابِ رائے کے بعد یہ طے پایا کہ بعد نماز مغرب دار العلوم میں بیان ہو جائے اور بعد نماز عشاء حضرت مولانا کے دولت کدہ پر بیان ہو۔

حضرت مولانا اعظمی دامت برکاتہم کے دولت کدہ پر بیان

نماز عشا حضرت مولانا اعظمی دامت برکاتہم کے نئے مکان کے سامنے والی مسجد میں ادا کی گئی، پھر وہاں پر طعام سے فارغ ہونے کے بعد حضرت اقدس کا دوسرا بیان ہوا۔ بیان سے قبل تلاوتِ قرآن کے بعد حضرت مولانا اعظمی دامت برکاتہم کی ایک نعت شریف حضرت مولانا کے پوتے عزیزم مولوی انور سلمہ نے سنائی جو حضرت اقدس کو بہت پسند ہے۔ وہ نعت بھی یہاں درج کی جارہی ہے۔

اس نعت کا ہر ہر شعر بلکہ یوں کہئے کہ ہر ہر مصرعہ بلکہ بلا مبالغہ ہر ہر ترکیب نحوی سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس نعت کا کہنے والا شخص نہ صرف یہ کہ ذات وصفات نبویہ سے واقف ہے بلکہ وہ علم کے اس مقام پر ہے جہاں الفاظ وتراکیب متکلم کے سامنے صف باندھے کھڑے ہیں کہ 'اپنے مافی الضمیر کے لیے ہم میں سے جو مناسب ہو اس کو استعمال کر لیجئے' نیز یہ بھی ملحوظ رہے کہ نعت بڑے احتیاط کی متقاضی ہوتی ہے، یعنی الفاظِ مدحیہ میں ایسی افراط نہ ہو جس سے منعوت علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات میں الوہیت کا شائبہ ہونے لگے، اور نہ ایسی تفریط ہو کہ شانِ منعوت میں گستاخی کا احتمال پیدا ہو جائے۔ گویا عقائد کی بنیادیں بھی متزلزل نہ ہوں اور نعت کا حق بھی ادا ہو جائے۔ آپ حضرات نعت شریف ملاحظہ فرمائیں اور میرے قول کی صداقت کو پرکھیں۔ میرا دعویٰ ہے کہ اوصافِ عالیۂ نبویہ کا شناسا اور فن لغت وفن شعر سے واقف کوئی بھی شخص میرے دعویٰ کی تردید نہیں کر سکے گا۔

نعت شریف

ازمحدث دوراں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی نوراللہ مرقدہ

وہ جہاں کا رمزِ وجود ہے، وہ مدارِ کارِ نظام ہے
وہ خدا کی شانِ جمال کا بخدا کہ مظہر تام ہے

کرو یاد معرکہ بدر کا، پڑھو فتحِ مکہ کا واقعہ
وہ خدا کا قہر وجلال تھا، یہ نبی کی رحمتِ عام ہے

سبھی انبیائے کرام کا ہے مقام سب سے بلند تر
وہ ہلالِ چرخِ کمال تھے، مرا شاہ بدرِ تمام ہے

جوغذائے روح وسکونِ دل ہےانھیں کی پاک حدیث ہے
جومریضِ دل کے لیےشفاہےانھیں کاپاک کلام ہے

جو مجھے ملا وہ ملا انھیں کی نگاہِ لطف وکرم سے ہے
قلم وزبانِ حبیبؔ کیاہےانھیں کافیضِ دوام ہے

وعظ کیسا ہونا چاہئے؟

ازمحدث دوراں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی نوراللہ مرقدہ

الحمد للّٰہ! نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا، من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ، ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریک لہ، ونشھد انَّ سیدنا ومولانا محمداً عبدہ ورسولہ، صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلی اٰلہٖ واصحابہٖ وبارک وسلم.

امّا بعد! فاعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم، بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم، قال اللّٰہ تبارک وتعالیٰ﴿وَذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾

آج کل جن حالات میں گزر رہا ہوں ان سے ایسا متاثر ہوں کہ وعظ وتذکیر کے کام سے برداشتہ خاطر ہو چکا ہوں، اس لیے اب تک جن جن محلوں سے میرے پاس دعوتیں آئیں میں نے

معذرت کر دی۔ آج بھی تقریر کرنے کے لیے بالکل آمادہ نہیں ہوں مگر آج کے حال نے مجھے تقریر کرنے پر مجبور کیا اس لیے بیٹھ گیا ہوں۔

آپ حضرات نے اجمالاً جان لیا ہوگا کہ آج صبح کو آپ کے قصبے میں ہندوستان کی ایک برگزیدہ ہستی جن کو وقت کے مغتنمات میں سے ہم کو اور آپ کو تصور کرنا چاہیے اور ہم سب لوگوں کو اللہ رب العزت کے اس انعام عظیم کا اس طرح شکر ادا کرنا چاہیے کہ ان کی ذات سے جو فیوض جاری ہیں ان فیوض سے ہم اور آپ سب حصہ لیں۔

وہ میری محبت میں اور میری گزارش پر آج صبح کو یہاں تشریف لائے۔ وعظ کے سلسلے میں کل تک میں نے ہر آدمی سے یہی جواب دیا تھا کہ میں ان کو یا کسی کو بھی کوئی زحمت دینا پسند نہیں کرتا۔ میرا معمول اور میرا اصول یہ ہے کہ کسی بزرگ یا کسی دوست کے ساتھ ایسا سلوک یا برتاؤ ہونا چاہیے جس میں عقیدت کے مظاہرے سے زیادہ یہ جذبہ کارفرما ہو کہ اس کو کوئی تکلیف نہ ہو، اس پر کوئی بار نہ ہو، بلکہ اس کو راحت ملے۔ اسی بنا پر جن لوگوں نے مجھ سے مولانا کے وعظ کی فرمائش کی ان سے میں نے صاف کہہ دیا کہ اگر ان کی مرضی نہ ہوگی تو میں کچھ ان سے نہ کہوں گا، لیکن اگر وہ پورے انشراح کے ساتھ تیار ہوں گے وہ بھی میرے کہنے کے اثر سے نہیں تو گزارش کر دی جائے گی۔ بہر حال مجھے بات لمبی نہیں کرنی ہے۔ ہماری اور آپ کی خوش قسمتی سے حضرت مولانا دامت برکاتہم نے پوری بشاشتِ قلب اور انشراحِ خاطر کے ساتھ اسے منظور فرمالیا کہ وہ آپ کو اور ہم کو اپنے فیض سے محروم نہ رکھیں گے اور اپنی ایمان افروز اور روح پرور تقریر سے ہم کو فائدہ پہنچائیں گے۔

ان کے اعزاز و اکرام اور ان کے احترام میں میرے لیے لازم تھا کہ میں ان کا تعارف کرادوں اور ان سے پہلے چند منٹ بول کر ان کے لیے راستہ ہموار کر دوں اس لیے کہ ایک مہمان کی عزت افزائی میں یہ بھی داخل ہے۔ ہمارے دین اور ہمارے اسلام نے جو ضیف کا اکرام واجب کیا ہے اس اکرامِ ضیف کے اندر یہ بات بھی داخل تھی۔ اس بنا پر میں اپنے ارادے کے برخلاف اور جو میں نے طے کر رکھا تھا اس کے برخلاف گویا خرقِ عادت کے طور پر تھوڑی دیر کے لیے آپ کے سامنے کچھ بولنے کے لیے آمادہ ہو گیا ہوں۔

بات یہ آ گئی تو اسی کے ساتھ یہ بھی کہہ دوں کہ دین کی باتوں سے جتنا تھوڑا بہت تعلق ہمارا رہ

گیا ہے اس تعلق کی بھی شکل بالکل بگڑ چکی ہے۔ یہ بات بہت غور سے سننے کی ہے اور بہت دھیان دینے کی ہے۔ مثال کے طور پر آپ سمجھیے کہ مثلاً بزرگوں کے ساتھ عقیدت، ان سے برکت اور نفع حاصل کرنا۔ بہت سے مسلمان ہیں جن کے اندر ابھی یہ روح بیدار ہے، مگر اسی کے ساتھ ہم سب کو جاننا چاہیے کہ ایسی کوئی صورت برکت حاصل کرنے کی اور ایسی کوئی صورت نفع حاصل کرنے کی اختیار کرنا ہمارے لیے ناروا ہے جس سے اس شخصیت کو کوئی تکلیف پہنچے۔

آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین جناب محمد رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جو محبت رکھتے تھے اور ان کو جو عقیدت آپ ﷺ سے تھی اور ان کو حضور ﷺ سے برکت حاصل کرنے کا جو جذبہ تھا قیامت تک پورے مسلمان مل کر وہ بات نہیں پیدا کر سکتے جو ایک صحابی کے اندر تھی۔ مگر ان کا تحصیل برکت کا طریقہ سمجھ بوجھ کا تھا اور اس ادب اور ہشیاری کا تھا جس کا کہ دین ہم سے متقاضی ہے۔

آپ دیکھتے ہیں کہ کوئی بزرگ شخصیت ہم میں آجاتی ہے تو اور کچھ تو رہ نہیں گیا ہے بس یہ ہے کہ جب وہ تقریر کر کے فارغ ہوں یا کہیں مل جائیں تو دھکے دے دے کر مصافحہ کرو، مسلمانوں کو بھی تکلیف پہنچاؤ اور ان بزرگ کو تو بالکل چور چور کر دو۔ قطعاً تحصیل برکت کا یہ طریقہ دینی اصول کے اعتبار سے صحیح نہیں، اسلامی تعلیم کے لحاظ سے یہ طریقہ بالکل غلط ہے۔

آپ کو معلوم ہوگا کہ حج میں حجر اسود کو بوسہ دینا، اس سے برکت حاصل کرنا کتنا ضروری کام ہے، مگر اس کے لیے کسی مسلمان کو تکلیف پہنچانا منع ہے، محمد رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ زحام میں ہاتھ سے بوسہ دینا ضروری نہیں، اگر ہاتھ نہ پہنچ سکے تو کسی لکڑی سے مس کر کے اس کو بوسہ دے لو ورنہ دور سے اشارے پر اکتفا کرو، مگر یہ نہیں کہ افغانیوں کی طرح ادھر ادھر دھکے دے کر کسی طرح پہنچ کر بوسہ دے ہی لو۔ یہ طریقہ بالکل ناجائز اور حرام ہے۔

ایک صحابی تھے، ان کی تمنا تھی کہ آنحضرت ﷺ میرے جنازے میں شرکت کریں۔ اتفاق سے رات کے وقت ان کا انتقال ہونے لگا تو انھوں نے نہایت سختی سے اپنے گھر والوں کو منع کیا کہ آنحضرت ﷺ کو میرے مرنے کی خبر نہ کرنا- کیوں کہ مدینہ منورہ یا دنیا کا کوئی شہر جس دن کی میں بات کر رہا ہوں- ایسا نہیں تھا کہ رات بقعۂ نور بنی رہتی ہو، بجلیوں کے قمقمے بلب اور راڈ لگے ہوئے ہوں۔ ارے کہیں کہیں کوئی ٹمٹماتا چراغ ہوتا تھا اور بس۔ اس لیے ان صحابی نے سوچا کہ رات کو

اندھیرے میں رسول اللہ ﷺ کو تکلیف دی جائے، آپ کو قبرستان تک لے جایا جائے، ممکن ہے راستے میں کوئی موذی جانور ہو اس سے آپ ﷺ کو تکلیف پہنچ جائے۔ تو ان صحابی نے اپنے فائدے کے لیے رسول اللہ ﷺ کی تکلیف کا احتمال جس چیز میں تھا اس کو گوارا نہیں کیا اور کہا کہ ہرگز ہرگز میرے مرنے کی خبر نہ کرنا۔ مگر اب یہ بات نہیں ہے، آج تو حال یہ ہے کہ اگر چہ وہ بزرگ مصافحہ کرتے کرتے مر جائیں مگر ہم کو برکت ضرور حاصل ہونی چاہیے۔

بہر حال مجھے یہ گزارش کرنا ہے کہ ان مغتنم اور برگزیدہ ہستی کے اکرام واحترام میں میں نے چاہا کہ چند منٹ آپ کے سامنے کچھ کہہ دوں۔ یہ جلسہ نہ تو میرے لیے منعقد کیا گیا ہے، نہ میرا بیان کا ارادہ ہی تھا۔ میں بالتبعیۃ محض حضرت مولانا کے اکرام واحترام میں بیٹھ گیا ہوں۔

میں نے اس وقت جو آیت آپ کے سامنے پڑھی ہے بہت مختصر ہے اور نہایت ہی اہم اور ضروری مضمون اس میں بیان ہوا ہے، بس ہمارے اور آپ کے دھیان دینے کی ضرورت ہے۔

حق تعالیٰ نے محمد رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا کہ ﴿وَذَكِّرْ﴾ تذکیر نصیحت اور یاددہانی آپ فرماتے رہیے۔ اس کے بعد فرمایا کہ ﴿فَإِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ یعنی ذکریٰ نصیحت اور یاددہانی بالیقین بلا شبہ ایمان والوں کو نفع پہنچاتی ہے۔

اس آیت میں حق تعالیٰ اتنے دعوے کے ساتھ فرما رہے ہیں کہ بیشک یقیناً تذکیر مومنین کو نفع پہنچاتی ہے۔ اب ہمارے اور آپ کے سوچنے کی بات ہے کہ آج روزانہ یہ وعظ کے جلسے اور یہ محفلیں جو منعقد ہوتی ہیں اگر یہ تذکیر کے لیے نہیں ہیں تو پھر اس کا مقصد بتایا جائے کہ کیا ہے؟ اور اگر تذکیر کے لیے ہیں تو اس تذکیر سے کتنا نفع پہنچتا ہے وہ آپ سوچ کر مجھے بتائیں۔ میں تو بہت سوچ چکا ہوں اور یہ دیکھتا ہوں کہ بالکل سو فیصد نفع سے خالی ہیں۔ چنانچہ ایک آدمی کے سامنے اگر جھوٹ بولنے کی مذمت بیان کی جائے تو اس تذکیر سے پہلے جتنا جھوٹا تھا کل کو اس سے کچھ بڑھ ہی کے جھوٹا ملے گا۔ بہر حال کم تو ہوتا نہیں۔ نماز کا پابند نہیں ہے، کوئی پابندی اس میں نماز کی پیدا نہیں ہوتی۔ حرام مال کھاتا ہے، قطعاً اجتناب کا جذبہ نہیں ہوتا، پس ہم کو اور آپ کو غور کرنا چاہیے کہ اس کی وجہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ تو دعوے کے ساتھ فرما رہے ہیں کہ تذکیر مومنین کو نفع پہنچاتی ہے اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہماری تذکیر سے نفع نہیں ہو رہا ہے تو اس کی دو ہی وجہ ہو سکتی ہے، یا تو تذکیر کے نام سے ہم جو کام کرتے ہیں وہ حقیقتاً تذکیر نہیں، یا پھر جو ایمان ہم سے مطلوب ہے وہ ایمان ہم میں نہیں، ورنہ اگر صحیح معنوں

میں تذکیر ہو اور صحیح معنوں میں ہم مومن ہوں تو ناممکن ہے کہ نفع نہ ہو، ضرور نفع ہوگا، حق تعالیٰ کا ارشاد برحق ہے۔

پس یہ بات میرے سوچنے کی بھی ہے جو مذکّر بن کر اس کرسی پر بیٹھتا ہوں اور آپ کے بھی سوچنے کی ہے جو متذکر بن کر وہاں بیٹھتے ہیں۔ میں اپنی نسبت کہہ دوں کہ خوب اچھی طرح جانتا ہوں کہ ہماری تذکیر تذکیر نہیں ہے۔ ہم قرآن کی آیت بھی پڑھتے ہیں، ہم حدیث بھی سناتے ہیں، ہم بزرگوں کے واقعات بھی بتلاتے ہیں مگر تذکیر بالحقیقت تذکیر کی صورت کا نام نہیں ہے، جس طرح شیر کی تصویر کا نام شیر نہیں ہے، درخت کی تصویر کا نام درخت نہیں ہے۔ اگر درخت کا فوٹو کسی کاغذ پر اتار لیجیے تو وہ فوٹو درخت نہیں ہے، بلکہ درخت یہ ہے کہ جو ہمارے سامنے کھڑا ہے۔ درخت کی حقیقت کے اوپر جو نتائج مرتب ہو سکتے ہیں وہ اس پر ہو سکتے ہیں، اس کی تصویر پر نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح شیر جو بڑا بہادر اور جری جانور تصور کیا جاتا ہے وہ کاغذ پر جو اس کا فوٹو بنا ہوتا ہے وہ نہیں ہے، کیوں کہ شیر کی صفات اس میں نہیں پائی جاتیں، وہ حملہ آور نہیں ہو سکتا، وہ شجاع اور بہادر نہیں ہے۔

اچھا میں اس سے بڑھ کر مثال آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں، نماز جو مدارِ نجات ہے، جو موجب دخولِ جنت ہے، جو جہنم سے نکالنے والی ہے، جس سے حق تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے، وہی مدار ہے حق تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہونے کا، وہ صرف اس ظاہری رکوع وسجود کا نام نہیں ہے، بلکہ آپ اللہ اکبر کہہ کر جتنے ارکان جتنے واجبات اور جتنے سنن ومستحبات نماز کے ہیں ان سب کی رعایت کر کے نماز پڑھیے اور اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی کے لیے پڑھیے تو وہ نماز ہے۔ چنانچہ دو شخص اسی طرح نماز پڑھیں جو شکل وصورت کے لحاظ سے، اجزائے ترکیبی کے لحاظ سے بالکل یکساں ہو مگر نیت کے اعتبار سے مختلف ہوں تو بظاہر تو دونوں برابر معلوم ہوں گی، مگر ایک کی نماز واقعی نماز ہے اور دوسرے کی نماز نماز نہیں، چنانچہ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

کلیدِ درِ دوزخ است آں نماز　　　　کہ در چشمِ مردم گزاری دراز

یعنی جو نماز لوگوں کو دکھانے کے لیے لمبی لمبی پڑھو وہ دوزخ کے دروازے کی کنجی ہے، یعنی اس سے جنت کا دروازہ نہیں کھلے گا بلکہ اس سے جہنم کا دروازہ کھلے گا۔

تو آخر کیا بات ہے کہ اس نماز کو جہنم کے دروازے کی کنجی کہا جا رہا ہے، بات یہ ہے کہ نماز کی صورت کا نام نماز نہیں ہے، حقیقی نماز کا نام نماز ہے اور حقیقی نماز وہ ہے جو لوگوں کو دکھانے کے لیے نہ پڑھی جائے بلکہ اللہ تعالیٰ کو دکھانے کے لیے پڑھی جائے اور اللہ ہی کی رضا وخوشنودی اس سے مقصود ہو۔

جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''مَنْ صَلّٰی وَهُوَ يُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَکَ وَمَنْ صَامَ وَهُوَ يُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَکَ'' یعنی جس نے نماز پڑھی مگر ریاکاری سے تو اس نے شرک کیا اور جس نے روزہ رکھا ریاکاری سے تو اس نے بھی شرک کیا۔

بس اس تمثیل کے بعد میں آپ سے کہتا ہوں کہ ہم قرآن کی آیتیں سناتے ہیں، رسول اللہ ﷺ کی حدیثیں سناتے ہیں، بزرگوں کے واقعات وملفوظات سناتے ہیں تو اگر اس سنانے کا مقصد یہ ہے کہ پوری دل سوزی سے آپ کی اصلاح کرنا چاہتا ہوں، آپ کو بھولا ہوا سبق یاد دلانا چاہتا ہوں، اس میں دوسری کوئی اور غرض شامل نہیں ہے تب تو یہ تذکیر واقعی تذکیر ہے۔ لیکن یہی سارے کام اگر اس لیے کروں کہ لوگ کہیں گے کہ مولانا نے بہت لاجواب تقریر کی اور واقعی آج تو دل خوش ہوگیا تو عربی کا ایک فقرہ مشہور ہے......

''الشئ اذا خلا عن مقصوده لغا''

جس نے بھی یہ بات کہی بالکل اصولی بات کہی کہ کوئی چیز اگر اپنے مقصود سے خالی ہو تو لغو اور بیکار ہے۔ ہماری یہ تذکیر اگر اپنے مقصود اصلی سے خالی ہے تو یہ تذکیر ہی نہیں ہے۔ اور آج ہماری تذکیر کے غیر نافع ہونے کا ایک سبب یہ بھی ہے اور دوسرا سبب ادھر بھی ہے یعنی ادھر (تذکیر میں) بھی نقص ہے اور اُدھر بھی پانی مرتا ہے کہ جو ایمان مطلوب ہے اس ایمان سے ہم عاری اور خالی ہیں ورنہ تو جناب محمد رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک ہی میں نہیں، بلکہ اس کے بعد بھی بہت دنوں تک اس تذکیر کا یہ حال تھا کہ مذکّر کرسیِ تذکیر پر بیٹھتا تھا اور وعظ کہتا تھا تو مجلس میں کئی کئی لاشیں ہوتی تھیں، لوگ تڑپ تڑپ کر مرجاتے تھے۔ اور محمد رسول اللہ ﷺ کی تذکیر کا تو پوچھنا ہی کیا ہے۔ آپ ﷺ کی جان کے دشمن، خون کے پیاسے، شرک سے آلودہ، ہمیشہ کے شرابی کبابی جواری بھی آپ ﷺ کی ایک تقریر سن کر ہر چیز سے تائب ہوجاتے تھے اور ایک ہی مجلس میں پاک وصاف ہوجاتے تھے، اس لیے کہ آپ کی تذکیر حقیقی تذکیر تھی، وہ نبوت ورسالت کی طاقت الگ سہی مگر تذکیر حقیقی تھی، اسی حقیقی تذکیر کا یہ اثر ہوتا تھا۔

آپ کہیں گے! وہ تو نبی تھے، ان کی کیا مثال دیتے ہو! تو میں عرض کرتا ہوں کہ اچھی بات ہے جو غیر نبی تھے میں ان کی مثال دیتا ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانۂ خلافت میں اعلان کردیا کہ کوئی شخص دودھ میں پانی نہ ملاوے۔ آج دیکھ لیجئے، ملاوٹ کے اوپر کتنے کتنے قانون بنتے ہیں، کیسی کیسی سزائیں مقرر ہوتی ہیں، کیسی کیسی جانچ اور انکوائری ہوتی ہے مگر آپ دیکھ لیجئے کچھ رک رہا ہے؟ اور

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دور دیکھیے کہ انھوں نے اس کی ممانعت کردی کہ دودھ میں کوئی پانی نہ ملاوے۔ایک لڑکی سویرے سحر کے وقت اٹھی اور دودھ دوہا۔اس کی ماں نے کہا کہ ابھی تو اندھیرا ہے، دیکھتا کون ہے، اس میں تھوڑا پانی ملا دے،لڑکی نے کہا ماں شاید تم مجھ کو یہ بتانا چاہتی ہو کہ عمر کو کیا خبر ہوگی، تو ٹھیک ہے عمر کو خبر نہیں ہوگی مگر عمر کا پیدا کرنے والا تو دیکھ رہا ہے(جس کے حکم سے عمر کی اطاعت واجب ہوئی ہے)

دیکھا آپ نے! یہ ان لوگوں کی تذکیر تھی، ان کی تذکیر دل سے ہوتی تھی، صحیح مقصد کو لیے ہوئے ہوتی تھی اس لیے اس کا اثر ہوتا تھا۔چنانچہ مشہور ہے...... ع

آنچہ از دل خیزد بر دل ریزد

یعنی وہ بات جو دل سے نکلتی ہے وہ دل پر اثر کرتی ہے۔

پس یہاں تذکیر کے نافع ہونے کے لیے دو شرطیں ہیں۔ایک تو صحیح معنوں میں تذکیر ہو، دوسرے سامعین میں جو ایمان مطلوب ہے وہ موجود ہو۔اور میں سمجھتا ہوں کہ اب بڑی حد تک یہ دونوں ہی شرطیں مفقود ہیں۔چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ٹھاٹ سے جلسے ہوتے ہیں، ہزار ہزار، دس دس ہزار بلکہ اس سے بھی زیادہ کا مجمع ہوتا ہے، تین تین دن جلسے ہوتے ہیں، دس دس مقرروں کی تقریریں ہوتی ہیں اور تقریر کرنے والے بھی پورا زور صرف کرڈالتے ہیں، دو دو چار چار گھنٹے تقریر کرجاتے ہیں مگر نفع کچھ بھی نہیں۔ اور یہ لمبی لمبی تقریریں خود اس بات کی دلیل ہیں کہ ہم صحیح معنوں میں سنت کے مطابق تذکیر نہیں کرتے۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "اِنَّ طُوْلَ صَلوٰةِ الرَّجُلِ وَقِصَر خُطْبَتِهٖ مِئِنَّةٌ مِنْ فِقْهِهٖ"، یعنی کوئی آدمی نماز تو لمبی پڑھے لیکن وعظ مختصر کرے یہ اس کے عقل مندی کی دلیل ہے۔گویا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرما رہے ہیں کہ یہ حماقت ہے کہ نماز تو بہت مختصر پڑھے اور خطبہ خوب لمبا دے۔ اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اصول تذکیر یہ نہیں تھا جواب ہے۔

صحیح بخاری پڑھو، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے تذکیر کے لیے پنج شنبہ کا دن مقرر کررکھا تھا۔لوگوں نے ان سے فرمائش کی کہ حضرت! ہفتہ میں ایک آدھ دن کا اور اضافہ فرما دیتے تو بہتر ہوتا، آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ "كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم يَتَخَوَّلُنَا بِالْمَوْعِظَةِ مَخَافَةَ السَّآمَةِ عَلَيْنَا" یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تذکیر کا یہ تھا کہ آپ گاہ گاہ اور کبھی کبھی ہماری خبر گیری نصیحت کے ساتھ فرمایا کرتے تھے تاکہ ہم اکتا نہ جائیں۔ بقیہ صفحہ ۴۹ پر

خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کا کمسنی میں عشق الٰہی کا شوق

از: ڈاکٹر عبدالمعید صاحب، کھیری باغ روڈ، مئو

سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفۂ اعظم اور جانشین شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ سید محمد گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ مدفون گلبرگہ (۸۲۵ھ) جن کے متعلق کسی صاحب نظر نے کہا ہے۔

ہر کہ مرید سید گیسودراز شد　　واللہ خلاف نیست کہ او عشق باز شد

ارشاد فرماتے ہیں:

حضرت قطب الدین رحمۃ اللہ علیہ کا مکان اوش میں تھا، اسی لیے ان کو اوشی کہا جاتا ہے، اوش ایک قصبہ کا نام ہے، اس میں مرغینان نام کا ایک گاؤں بھی ہے، شیخ قطب الدین رحمۃ اللہ علیہ اکثر مرغینان میں بھی رہتے تھے۔ مرغینان سے باہر دہلی کے منارہ جیسا ایک بہت بڑا منارہ تھا، لیکن صاف ستھرا نہ تھا اور نہ وہاں لوگوں کی آمد ورفت تھی۔ وہ بڑی ڈراؤنی جگہ سمجھی جاتی تھی، ہر شخص کو جانے کی وہاں ہمت نہ تھی، لوگ کہتے تھے کہ وہاں خواجہ خضر رہتے ہیں، حضرت خواجہ قطب الدین اوشی رحمۃ اللہ علیہ کی عمر اس وقت سولہ سال کی تھی۔ وہ ایک مرتبہ جمعہ کی رات کو وہاں گئے اور خواجہ خضر علیہ السلام کی ملاقات کے لیے تمام رات عبادت کرتے اور دعا پڑھتے رہے، لیکن کسی سے ملاقات نہ ہوئی، وہ ناامید ہو کر واپس آرہے تھے کہ راستہ میں ایک بزرگ آدمی سے ملاقات ہوگئی، انھوں نے پوچھا، اے بچے کہاں گئے تھے؟ حضرت خواجہ قطب الدین رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا اس منارہ کے نیچے، ان بزرگ نے کہا کہ وہ تو بہت خراب اور ہیبت ناک جگہ ہے، وہاں کس لیے گئے تھے، حضرت قطب الدین نے جواب دیا کہ میں نے سنا ہے کہ جو شخص جمعہ کی رات کو اس جگہ عبادت وریاضت کرتا ہے خواجہ خضر علیہ السلام اس سے

ملاقات کرتے ہیں۔ ان بزرگ نے پوچھا خواجہ خضر سے ملاقات ہوئی؟ انھوں نے جواب دیا نہیں۔ ان بزرگ نے پوچھا اگر ملاقات ہوتی تو کیا کرتے؟ انھوں نے جواب دیا، ان سے اللہ کی محبت کرنا سیکھتا۔ ان بزرگ نے کہا میرے ساتھ چلے آؤ، وہ بزرگ حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ کو آبادی میں لے آئے اور ایک بافندہ (کپڑا بننے والے) کے گھر کے دروازہ پر جا کر کھڑے ہوگئے۔ اندر سے ان کو بلایا اور کہا اے جناب! یہ بچہ رات میرے یہاں گیا تھا اور بہت بڑی چیز کا طالب ہے اور اس کی خواہش کو رد نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اس کپڑا بننے والے نے پوچھا کہ یہ بچہ کیا چاہتا ہے؟ ان بزرگ نے کہا عشق الٰہی چاہتا ہے، اس بافندہ کی آنکھوں میں اللہ سے محبت کا ذکر سن کر آنسو آگئے۔ انھوں نے کہا میں ان کو سکھادوں گا۔ پھر ان کو کھڑا کر کے ان کے لیے عشق الٰہی میں سرشار ہونے کی دعا فرمائی۔

(جوامع الکلم، ملفوظات خواجہ بندہ نواز گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ)

انہی بافندہ بزرگ کی دعاؤں کا اثر تھا کہ محبت الٰہی کی یہ آگ بڑھتی و پھیلتی چلی گئی، خواجہ خواجگان حضرت معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات وملازمت کا شرف حاصل ہوا جن کی رہبری سے کمال وتکمیل کے مدارج تک پہنچے اور علماء اور مشائخ کی موجودگی میں خرقۂ خلافت سے سرفراز ہوئے۔ ہندوستان تشریف لائے اور اپنے شیخ کے حکم وہدایت سے دہلی کو اپنا مستقر بنایا اور اپنے بوریائے فقر پر بیٹھ کر سرگرمی سے ارشاد وتربیت کا کام انجام دینا شروع کیا اور ان کے ہاتھوں ہندوستان میں اسلام کا ''چشمۂ حیواں'' جاری ہوا۔

سلطان شمس الدین ہفتہ میں دو بار حاضری دیتا اور اخلاص وعقیدت کا اظہار کرتا، دہلی میں جو نہ صرف ہندوستان کا دارالحکومت بلکہ عالم اسلام کی نئی طاقت اور دعوت وتجدیدِ اسلام کا نیا مرکز تھا اور جہاں عالمِ اسلام کے ممتاز ترین علماء واساتذہ، سادات وشرفاء اور مشائخ واہل سلسلہ اور دنیائے اسلام کے بہترین دل ودماغ جمع تھے، اشاعت طریق وتربیت قلوب اور نئی ابھرتی ہوئی اسلامی سلطنت کی رہنمائی کا کام اپنے دامن فقر واستغناء کو ذرہ برابر آلودہ اور تر کیے بغیر انجام دینا بڑا نازک اور مشکل کام تھا اور اس کے لیے پہاڑ سی استقامت اور ہوا کی سی سبک روی اور سبک گامی کی ضرورت تھی جس سے کسی شیشے کو ٹھیس نہ لگے، خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی کامیابی اور خوش اسلوبی کے ساتھ اس نازک اور دشوار کام کو انجام دیا۔ اُن کو اس خدمت کے لیے طویل زمانہ نہیں ملا، اپنے شیخ کے بعد تو مشکل سے

۴-۵ سال وہ زندہ رہے، لیکن ان کی ذات سے ہندوستان میں نہ صرف سلسلہ چشتیہ کی بنیاد پڑ گئی، بلکہ جن مقاصد عالیہ کے لیے خواجہ معین الدین رحمۃ اللہ علیہ نے ہندوستان کو اپنے قیام و کام کے لیے انتخاب کیا تھا وہ صدیوں کے لیے محفوظ ہو گئے۔

ابھی ان کی عمر ۵۰ سال یا اس سے کچھ اوپر ہوئی تھی کہ عشق و محبت الٰہی کی وہ آگ، جس کو انھوں نے صبر وضبط کے فانوس میں مقید اور ہدایت و تربیت خلق کی مصلحت سے مغلوب کر رکھا تھا، بھڑکی اور جذب الٰہی کا غلبہ ہوا۔ ایک مرتبہ شیخ علی سکّری کی خانقاہ میں مجلس سماع گرم تھی، قوال نے شعر پڑھا ؂

کشتگان خنجر تسلیم را ہر زماں از غیب جان دیگر است

خواجہ قطب الدین رحمۃ اللہ علیہ پر وجد طاری ہو گیا، خانقاہ سے قیام گاہ پر تشریف لائے، وہی مدہوشی اور تحیر کا عالم تھا، اسی شعر کی فرمائش تھی، فرمائش کی تعمیل کی جاتی تھی، چار شبانہ روز عالم تحیر میں رہے لیکن جب نماز کا وقت آجاتا ہوش آجاتا، نماز ادا کرتے، پھر اسی شعر کی فرمائش کرتے، شعر پڑھا جاتا اور عالم تحیر میں چلے جاتے۔ پانچویں رات کو انتقال کیا۔ یہ واقعہ ۶۲۳ھ کا ہے۔

حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاء کی تعداد ۹-۱۰ سے کم نہ تھی، لیکن آپ کی جانشینی اور حضرت خواجہ معین الدین رحمۃ اللہ علیہ کے کاموں اور مقاصد کی تکمیل و توسیع کی سعادت حضرت خواجہ فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کے حصہ میں آئی۔ جس طرح خواجہ معین الدین رحمۃ اللہ علیہ ہندوستان میں سلسلہ چشتیہ کے مؤسس اور بانی ہیں، خواجہ فرید الدین رحمۃ اللہ علیہ اس کے مجدد اور اس سلسلہ کے آدم ثانی ہیں۔ آپ ہی کے دو خلفاء سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شیخ علاؤ الدین علی صابر پیران کلیری کے ذریعہ یہ سلسلہ ہندوستان میں پھیلا اور ان کے خلفاء و اہل سلسلہ کے ذریعہ اب بھی زندہ و قائم ہے ع

خم و خمخانہ با مہر و نشاں است

(تاریخ دعوت و عزیمت حصہ سوم ص ۳۷-۳۶-۳۵-۳۴)

عورت کے لباس وآرائش کی حدود

مقالہ نگار: شیخ وہبی سلیمان غاوجی
ترجمہ: امداداللہ امیرالدین
نائب استاذ فقہ، شعبۂ دینیات، اسلامیہ کالج دبئی
مئوی، قاسمی

اللہ جل شانہ نے انسان کو ایک ذات سے پیدا کیا، اور اسی ذات سے اس کی رفیقۂ حیات کو وجود بخشا، پھر ان دونوں سے کروڑوں انسان تخلیق کیے، اور یہ سلسلہ تا قیامت جاری وساری رہے گا، حدیث نبوی: ''تم سب آدم سے وجود میں آئے اور آدم مٹی سے''، کی روشنی میں تمام بنی نوع انسان ایک ماں باپ کی اولاد ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ زندگی کی راست روی وخوشنمائی اور اسے مقاصد سے ہمکنار کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے نظم وترتیب کے پیشِ نظر ہر چیز کے جوڑے بنائے ہیں، جن میں سے ہر ایک کو ایسے متعدد مناسب اوصاف سے آراستہ کیا ہے جو دوسرے کی صفات سے مل کر ہی مکمل ہوتے ہیں، نتیجۂ زندگی استوار ہوجاتی ہے، چنانچہ مرد کے اندر طاقت وقوت، سختی وقوت ارادی، ثبات قدمی اور گھر سے باہر رہنے کی صفت ودیعت کی ہے، جب کہ عورت کو ضعف ونرمی، شرم وحیا، آرائش پسندی، بچوں سے الفت اور گھر کے اندر کے انتظام وانصرام جیسی خصوصیات سے مزین کیا ہے، ان اوصاف کے طبعاً مختلف ہونے کی بناء پر باہم فرق کے ساتھ دنیوی حیات بہتر اور درست رہ سکتی ہے، اور اگر ان میں ایسی یگانگت ہوجائے، کہ مرد مردانہ وزنانہ اوصاف کو اختیار کرلے اور عورت زنانہ ومردانہ صفات کو اپنالے، تو زندگی ناہموار ہوجائے گی، اللہ تعالیٰ نے مرد وعورت میں سے ہر ایک کو ایسی بہت سی خصوصیات اور امتیازی اوصاف سے نوازا ہے جو دوسرے کو میسر نہیں ہیں، جس پروردگار نے انسانوں کو مناسب سانچے میں ڈھالا ہے، جو اپنی مخلوق پر ماؤں سے کہیں زیادہ رحم کرنے والا ہے، اگر اس رب العالمین کے مقرر کردہ نقوش پر حیات کو گامزن رکھنا مقصدِ زندگی ہو، تو مرد وعورت میں سے ہر ایک کو اپنے اپنے مقصد اور فطرت کے مطابق زندگی گزارنا ضروری ہوگا، یہی وجہ ہے کہ جب ام

المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے مردوں کی طرح راہ جہاد میں نکلنے کی خواہش ظاہر کی، اور یہ تمنا کی کہ مردوں کے مساوی عورتوں کی میراث بھی ہوتی، نیز مردوں کو یہ خیال گذرا کہ ہمیں آخرت میں نیکیوں کے باب میں عورتوں پر اسی طرح بالا دستی حاصل رہے گی جس طرح میراث میں حاصل ہے، تو اللہ تعالیٰ نے یہ فرمان نازل فرمایا کہ: ''تم لوگ اس چیز کی تمنا نہ کرو جس کے سلسلے میں اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر فوقیت دے رکھی ہے، مردوں کے لیے ان کی کاوشوں کا صلہ ہے، اور عورتوں کے لیے ان کی کوششوں کا ثمرہ، تم لوگ اللہ سے اس کے فضل کا سوال کرو، یقیناً اللہ تعالیٰ ہر چیز کو بخوبی جانتے ہیں''۔ (سورہ نساء، آیت ۳۲) (۱)

چونکہ عورت کی فطرت اور اوصاف و عادات سے متعلق اس کے فرائض منصبی مردوں سے جدا ہیں، اور قدرت نے مرد و عورت کے مابین طبعی میلان رکھا ہے، اس لیے اسلام نے دونوں کو تقویٰ اور خشیت الٰہی کے مضبوط حصار میں باندھ رکھا ہے، اور ہر ایک کے لیے اس کی فطرت اور منصب کے مناسبِ حال ستر اور لباس متعین کیے ہیں، نیز اللہ کے حکم سے فتنہ وفساد کی بیخ کنی کے مقصد سے عورتوں کے لیے پردہ کرنے، بلا ضرورت گھروں سے نہ نکلنے، مردوں سے اختلاط اور ان کے ساتھ تنہا نہ رہنے کو لازم کیا ہے، کیوں کہ بے پردگی اور مردوں کے ساتھ اختلاط سے بسا اوقات ایسے نتائج سامنے آتے ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتے۔

عورت کا پردہ:

عورت کی فطرت اور اس کے دنیوی فرائضِ منصبی پردے کے متقاضی ہیں، عورت کی تخلیق ہی اس لیے ہوئی ہے کہ وہ ایک مرد کی ہو کر رہے، بچے تو ایک باپ کی طرف منسوب ہوتے ہی ہیں، اور پردے کے ترک کرنے اور مردوں سے اختلاط میں ایسے مفاسد پوشیدہ ہیں جو نسب کے ضیاع اور خاندانوں کی بربادی کا سبب بن جاتے ہیں، برطانیہ کی ایک سرکاری تقریب میں جس میں خلافتِ عثمانیہ کے سفیر شریک تھے، ایک انگریز نے ان کی موجودگی میں اپنے ساتھی سے کہا: کہ یہ عثمانی لوگ اپنی عورتوں کو اجنبیوں سے ملنے نہیں دیتے، تو عثمانی سفیر نے کہا کہ ہاں، کیوں کہ ہم چاہتے ہیں کہ ہماری بیویاں صرف ہمارے بچے پیدا کریں۔ اس جواب پر انگریز ہکا بکا رہ گیا۔

(۱) تفسیر قرطبی: ۱۶۲/۵، مختصر تفسیر ابن کثیر ۳۸۲/۱

پردے کے تعلق سے قرآنی نصوص اوران کی تفاسیر:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اے ایمان والو! نبی کے گھروں میں مت جایا کرو، مگر جس وقت تم کو کھانے کی اجازت دی جائے، ایسے طور پر کہ اس کی تیاری کے منتظر نہ رہو، لیکن جب تم کو بلایا جاوے تب جایا کرو، پھر جب کھانا کھا چکو تو اٹھ کر چلے جایا کرو، اور باتوں میں جی لگا کر مت بیٹھے رہا کرو، اس بات سے نبی کو ناگواری ہوتی ہے، سو وہ تمھارا لحاظ کرتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ صاف بات کہنے سے لحاظ نہیں کرتا، اور جب تم ان سے کوئی چیز مانگو تو پردہ کے باہر سے مانگا کرو، یہ بات تمھارے دلوں اور ان کے دلوں کو پاک رکھنے کا عمدہ ذریعہ ہے، اور تم کو جائز نہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو کلفت پہنچاؤ، اور نہ یہ جائز ہے کہ تم آپ کے بعد آپ کی بیبیوں سے کبھی بھی نکاح کرو، یہ خدا کے نزدیک بڑی بھاری بات ہے۔(سورہ احزاب، آیت ۵۳)

امام احمد اور امام بخاری رحمہما اللہ وغیرہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ کی خدمت میں نیک و بد ہر طرح کے لوگ آتے رہتے ہیں، تو کیا ہی اچھا ہوتا اگر آپ امہات المومنین کو پردے کا حکم فرما دیتے، اسی کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ آیتِ حجاب نازل فرمائی۔ (۱)

علامہ قرطبی فرماتے ہیں: کہ یہ آیتِ کریمہ اس مسئلے کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ضرورت اور مسئلہ پوچھنے کے وقت پردے کے پیچھے سے سوال کی اجازت دی ہے، اس حکم میں ساری عورتیں دو وجہ سے شریک ہیں، ایک تو آیت کے معنی کی وجہ سے، دوسرے اس شرعی اصول کی وجہ سے کہ عورت مکمل پردہ کی چیز ہے۔ (۲)

امام جصاص رازی اس آیت کے تحت لکھتے ہیں: کہ یہ حکم اگر چہ خاص طور پر نبی کریم ﷺ اور آپ کی ازواجِ مطہرات کے سلسلے میں نازل ہوا ہے، لیکن اس کے مفہوم میں دوسری عورتیں بھی شامل ہیں، کیونکہ آپ کے ساتھ مخصوص احکام کو چھوڑ کر دوسرے تمام احکام میں ہم کو آپ کی اتباع اور پیروی کا حکم دیا گیا ہے۔ (۳)

---

(۱) بخاری مع فتح الباری: ۸/ ۱۶۸، ۵۶۷، مسند احمد ۱/ ۲۳

(۲) الجامع لاحکام القرآن ۱۴/ ۲۲۷

(۳) احکام القرآن: ۳/ ۳۶۹

عصرِ حاضر کے شیخ المفسرین محمد امین شنقیطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس کتاب مقدس کے ترجمہ میں ہم یہ بات نقل کر چکے ہیں کہ قرآنِ کریم کے بیان کی ایک قسم یہ ہے کہ کسی آیت کے سلسلے میں کچھ علماء ایک قول اختیار کرتے ہیں، حالانکہ اسی آیت میں ایسا قرینہ موجود ہوتا ہے جو اس قول کے بطلان پر دلالت کرتا ہے، اس قسم کی مثال آیتِ حجاب یعنی ''وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعاً فَاسْئَلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ'' کے سلسلے میں بہت سے لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ یہ آیت نبی کریم ﷺ کی ازواجِ مطہرات کے ساتھ خاص ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ کا اپنے ارشاد ''ذٰلِكُمْ أَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَقُلُوْبِهِنَّ'' میں اس وجوبِ حجاب کے حکم کا سبب (مرد وعورت کے قلوب کی شک وشبہ سے پاکیزگی کو قرار دینا) اس بات کا واضح قرینہ ہے کہ یہ حکم عام ہے، کیونکہ کوئی مسلمان یہ کہنے کی جسارت نہیں کر سکتا کہ ازواجِ مطہرات کے علاوہ کسی مرد یا عورت کو پاکیزگیٔ قلب کی ضرورت نہیں ہے، نیز یہ اصول بھی ثابت شدہ ہے کہ علت اپنے معلول کو عام وشامل ہوتی ہے (۱)۔

آیتِ حجاب کے تمام مومنات کے لیے عام ہونے کی دلیل علامہ طبری رحمہ اللہ کا یہ قول بھی ہے کہ جب تم ازواج مطہرات یا دیگر مومن عورتوں سے جو تمھاری بیویاں نہیں ہیں، کوئی چیز مانگو تو پردہ کے پیچھے سے مانگا کرو، تمھارے اور ان کے درمیان پردہ رہے، تم ان کے پاس ان کے گھروں میں مت جایا کرو، تمھارا اس طرح پردے کے پیچھے سے سوال کرنا تمھارے اور ان کے دلوں کو ان فتنوں سے پاک رکھنے کا عمدہ ذریعہ ہے جو عورتوں کے تعلق سے مردوں، اور مردوں کے تعلق سے عورتوں کے دلوں میں پیدا ہوتے رہتے ہیں، اور ایسا کرنا تمھارے مابین شیطان کے راہ نہ پانے کے لیے بہت مناسب ہے (۲)۔

حجاب کیا ہے؟:

حجاب کے لغوی معنی پردہ کے ہیں، لسان العرب میں ہے: حجاب بمعنی ستر، امرأة محجوبة، بمعنی وہ عورت جس نے پردہ کر رکھا ہو، اور مصباح المنیر میں ہے حجب باب قتل سے روکنے کے معنی میں آتا ہے، اسی لیے پردہ کو حجاب کہتے ہیں کیونکہ وہ مشاہدہ سے مانع ہوتا ہے، اور حجاب میں اصل یہ ہے کہ وہ دو جسموں کے درمیان حائل چیز ہو۔ اور شرعی لحاظ سے حجاب ایسے مکمل لباس کا نام

(۱) اضواء البیان: ۶/۵۸۴　　(۲) جامع البیان عن تاویل آي القرآن: ۲۲/۳۹

ہے جس سے مسلمان عورت ستر پوشی کرے، تاکہ اس کے جسم کے کسی حصے پر غیر مردوں کی نظر نہ پڑے [۱]۔حجاب کی حدوداور اس کی فطرت کے سلسلے میں فقہاء کے اقوال آگے آرہے ہیں۔

عورت مجسم سامانِ زینت ہے، اور ان کی طرف میلان وچاہت مردوں کی فطرت میں داخل ہے، جس طرح مرد کے سامنے ہتھیار ڈال دینا عورت کی فطرت ہے، ایسے میں اگر شرعی حدود قائم نہ ہوں تو بہت سے مفاسد جنم لیں گے۔سابقہ شریعتوں، بلکہ ہندو نہ مذاہب میں بھی ہمیں پردے کے تعلق سے بہت سی باتیں ملتی ہیں، خلاصہ یہ کہ شرعی مصلحت پردے کے اثبات میں مضمر ہے، علامہ شاطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: شریعتوں کی وضع درحقیقت بندوں کی ہمہ وقتی مصلحتوں کے پیش نظر ہوتی ہے۔

دوسری آیت کریمہ یہ ہے: ''آپ مومن عورتوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی نگاہیں جھکی رکھیں، اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں، اپنے مواقعِ زینت کو ظاہر نہ کریں، اِلا یہ کہ وہ ظاہر ہوں، اور انھیں چاہئے کہ اپنے سینوں پر دوپٹے ڈال لیا کریں، اور وہ اپنے زینت کے مواقع صرف اپنے شوہروں اور ...... کے سامنے ہی کھولیں''۔(سورہ نور ۳۱)

چہرہ کھولنے اور چھپانے کے سلسلے میں علماء کے اقوال:

عورت کے لیے چہرہ اور دونوں ہتھیلیاں کھولنا درست ہے، متقدمین حنفیہ، مالکیہ اور بعض شوافع نے اس قول کو اختیار کیا ہے، البتہ شوافع کے نزدیک یہ قول مرجوح ہے، چہرہ کی تحدید لمبائی میں سر کے بال اگنے کی جگہ سے ٹھوڑی کے نیچے تک، اور چوڑائی میں دونوں کانوں کی لَو کے درمیان ہے، جواز کا یہ قول بعض صحابہ مثلاً حضرت ابن عباس وابن عمر رضی اللہ عنہم، اور بعضے تابعین مثلاً حضرت سعید بن جبیر اور عطاء رحمہما اللہ سے بھی منقول ہے۔

شیخ المفسرین نے آیت کریمہ: ''وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا ''(اور نہ ظاہر کریں اپنے مواقعِ زینت، مگر جن کا ظاہر کرنا ناگزیر ہو) سے متعلق اقوال کا استیعاب کرنے کے بعد لکھا ہے: کہ زیادہ درست ان لوگوں کا قول ہے جو کہتے ہیں کہ اس سے مراد چہرہ اور ہتھیلیاں ہیں، اگر بات یہی ہے تو سرمہ، انگوٹھی، کنگن اور خضاب (مہندی) بھی اس حکم میں داخل ہوں گے [۲]۔

---

(۱) دیکھئے ''حجاب المسلمہ''ص ۲۷، ۲۸، مصنفہ دکتور محمد فؤاد البرازی۔

(۲) جامع البیان: ۲۲/ ۳۹، قرطبی: ۱۲/ ۲۲۸

امام جصاص رازی حنفی اس آیت کے تحت لکھتے ہیں: ''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ، حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت عطاء رحمۃ اللہ علیہ سے اس آیت کریمہ کا یہ معنیٰ نقل کیا گیا ہے کہ چہرے اور ہتھیلی پر جو سرمہ یا خضاب ہوتا ہے اسی کو ظاہرِ زینت سے تعبیر کیا گیا ہے، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح کی بات منقول ہے، نیز حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ بھی مروی ہے کہ ظاہری زینت سے مراد ہتھیلی، چہرہ اور انگوٹھی ہیں، اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ کان کی بالیاں، کنگن اور چھلہ یعنی وہ بڑی انگوٹھی جو انگلی میں پہنی جاتی ہے، یہی ظاہری زینت ہیں، حضرت ابوعبیدہ کے نزدیک انگوٹھی مراد ہے، حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک چہرہ اور ظاہری کپڑے مراد ہیں، نیز حضرت سعید بن المسیب رحمۃ اللہ علیہ اس بات کے قائل ہیں کہ **ما ظھر منھا** سے عورت کا چہرہ مراد ہے، حضرت احوص نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ زینت کی دو قسمیں ہیں: ایک باطنی زینت، جسے صرف شوہر دیکھ سکتا ہے، مثلاً تاج، کنگن اور انگوٹھی، دوسری ظاہری زینت تو اس سے کپڑا مراد ہے، اسی طرح حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کپڑے ہی کو ظاہری زینت قرار دیا ہے[1]۔ اس کے بعد امام جصاص رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ ہمارے علماءِ احناف کے نزدیک زینتِ ظاہرہ جس کا اظہار درست ہے، وہ چہرہ اور دونوں ہتھیلیاں ہیں، کیوں کہ سرمہ چہرے کی زینت ہے اور منہدی اور انگوٹھی ہتھیلی کی، جب چہرے اور ہتھیلی کی زینت کا دیکھنا درست قرار دیا گیا تو یہ لامحالہ چہرے اور ہتھیلی کے دیکھنے کے جواز کا تقاضہ کرے گا[2]۔

امام ابوبکر بن العربی مالکی رحمۃ اللہ علیہ اپنی تفسیر میں آیتِ کریمہ ''إلا ما ظھر منھا'' کے تحت لکھتے ہیں کہ زینت کی دو قسمیں ہیں: خِلقی اور کسبی، خلقی زینت تو عورت کا چہرہ ہے جو زینت کی بنیاد اور فطری خوبصورتی سے عبارت ہے، اور کسبی زینت ان تکلفات کا نام ہے جو عورت اپنی شکل وصورت سنوارنے کی لیے اٹھاتی ہے، مثلاً کپڑے، زیورات، سرمہ اور منہدی وغیرہ، اسی قبیل سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد: ''خُذُوا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ'' بھی ہے، جس میں زینت سے مراد کپڑے ہیں۔ اور اللہ جل شانہ کے فرمان: ''إلا ما ظھر منھا'' میں ظاہری زینت کی مراد میں علماء کے تین قول ہیں: ایک یہ کہ اس سے مراد کپڑے ہیں، یعنی خاص طور پر عورت کے جو کپڑے ظاہر ہوتے ہیں، اس کے

---

(۱) تفسیر طبری: ۹۴/۱۸

(۲) الجامع لاحکام القرآن: ۳۱۵/۳

قائل حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہیں، دوسرا قول یہ ہے کہ سرمہ اور انگوٹھی مراد ہیں، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے، جب کہ تیسرا قول یہ ہے کہ چہرہ اور دونوں ہتھیلیاں مراد ہیں، یہ قول دوسرے قول کے مثل ہے، کیوں کہ سرمہ اور انگوٹھی چہرے اور ہتھیلی ہی میں ہوتے ہیں، البتہ ایک دوسرے اعتبار سے دونوں قولوں میں فرق ہے، کہ جو لوگ چہرہ اور ہتھیلیاں مراد لیتے ہیں، ان کے نزدیک سرمہ اور انگوٹھی نہ ہونے ہی کی صورت میں یہ دونوں ظاہری زینت کا مصداق ہوں گے، اور اگر ان کے ساتھ سرمہ اور انگوٹھی لگے ہوئے ہوں تو دونوں کو چھپانا واجب ہوگا، اور یہ باطنی زینت کہلائیں گے، ابن القاسم نے حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کیا ہے کہ منہدی ظاہری زینت میں سے نہیں ہے (۱)۔

علامہ ابن کثیر شافعی ''ولا یبدین زینتهن إلا ما ظهر منها'' کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ اجنبیوں کے سامنے ذرا بھی زینت کا اظہار نہ کریں، اِلا یہ کہ اس کا چھپانا ممکن ہی نہ ہو، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا جیسے چادر اور کپڑے، ان ہی کے قول کو حضرت بصری رحمۃ اللہ علیہ، ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ اور ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے اختیار کیا ہے، امام اعمش حضرت سعید بن جبیر کے واسطے سے ''إلا ما ظهر منها'' کی تفسیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول نقل کرتے ہیں کہ اس سے مراد چہرہ، ہتھیلیاں اور انگوٹھی ہے، پھر علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ ممکن ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور ان کے متبعین نے ''إلا ما ظهر منها'' سے چہرہ اور دونوں ہتھیلیاں مراد لی ہوں، یہی جمہور کے نزدیک مشہور ہے، اور اسی کی تائید حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو امام ابوداؤد نے نقل کی ہے، کہ ایک مرتبہ حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس حالت میں آئیں کہ ان کے جسم پر باریک کپڑے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے رخِ انور پھیر لیا، اور فرمایا کہ اے اسماء! جب عورت سنِ بلوغ کو پہنچ جائے تو اس کا صرف یہ اور یہ حصہ نظر آنا درست ہے، اور آپ نے اپنے چہرے اور دونوں ہتھیلیوں کی جانب اشارہ کیا (۲)۔

---

(۱) حوالۂ سابقہ، اور تفسیر قرطبی: ۱۲/ ۲۲۸ دیکھئے
(۲) تفسیر ابن کثیر: ۳/ ۲۸۳،

عورت کے لیے چہرہ اور ہتھیلیاں کھولنا مباح ہونے کے تعلق سے جمہور فقہاء کے اقوال:

فقہ حنفی کی کتاب ''مختصر القدوری'' میں ہے: ''مرد کا اجنبی عورت کو دیکھنا جائز نہیں ہے، صرف اس کے چہرے اور ہتھیلیوں کو دیکھ سکتا ہے، اور اگر شہوت کا اندیشہ اور خوف ہو تو بلا ضرورت چہرہ بھی نہ دیکھے(۱)''۔

نیز ''ہدایہ'' میں ہے: مرد کے لیے کسی اجنبی عورت کو دیکھنا درست نہیں ہے، صرف چہرہ اور ہتھیلیاں دیکھ سکتا ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''**ولا یبدین زینتهن إلا ما ظهر منها**'' (اور عورتیں اپنی زینت ظاہر نہ کریں الا یہ کہ ظاہر ہونا ناگزیر ہو)(۲)۔

امام نووی کی ''المجموع شرح المہذب'' میں امام شافعی رحمہ اللہ کا قول نقل کیا ہے کہ آزاد عورت چہرہ اور ہتھیلیوں کے علاوہ مکمل پردے کی چیز ہے(۳)۔

علامہ دردیر مالکی کی ''شرح صغیر'' میں ہے کہ اجنبی مرد کے سامنے آزاد عورت کا ستر چہرہ اور ہتھیلیوں کے علاوہ ہے(۴)۔

فقہائے متاخرین کی رائے میں خوفِ فتنہ کی بناء پر چہرہ بھی ستر ہے:

فقہ حنفی کی کتاب ''نور الایضاح'' میں منقول ہے کہ چہرہ اور ہتھیلیوں کے سوا آزاد عورت کا مکمل جسم ستر ہے، علامہ طحطاوی نور الایضاح کی شرح مراقی الفلاح پر اپنے حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ جوان عورت کے لیے چہرہ کھولنا فتنہ کے خوف کی وجہ سے ممنوع ہے، نہ کہ ستر ہونے کی وجہ سے(۵)۔

''مجمع الانہر'' میں ''المنتقی'' کے حوالے سے لکھا ہے کہ جوان عورت کو چہرہ کھولنے سے اس لیے منع کیا گیا ہے کہ وہ فتنہ میں نہ ڈال دے، اور ہمارے زمانے میں غلبۂ فساد کی بناء پر یہ حکم واجب بلکہ فرض ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ''آنکھوں کے سوا عورت کا مکمل جسم ستر ہے''۔ ضرورت کے دفعیہ کے لیے کافی ہے(۶)۔

---

(۱) شرح اللباب: ۳/ ۲۱۷ (۲) حاشیۂ عینی علی الہدایہ: ۴/ ۲۲۳
(۳) المجموع: ۴/ ۱۵۸ (۴) شرح صغیر: ۱/ ۸۹
(۵) ۱/ ۱۶۶ (۶) ۱/ ۸۸

''درمختار'' میں ہے کہ عورت کو اجنبیوں کے روبرو چہرہ کھولنا ممنوع ہے، اس کی وجہ چہرہ کا ستر ہونا نہیں ہے، بلکہ خوفِ فتنہ اس حکم کا سبب ہے، علامہ ابن عابدین فرماتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ چہرہ کھولنا اس اندیشہ کی بنا پر ممنوع ہے کہ مرد حضرات چہرہ دیکھ کر فتنہ میں مبتلا نہ ہو جائیں، کیوں کہ اگر چہرہ مستور نہ ہو تو بسا اوقات اس پر شہوت بھری نگاہ بھی پڑ جاتی ہے (۱)۔

مالکیہ میں سے شیخ حطاب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر عورت سے فتنے کا اندیشہ ہو تو اس کو چہرہ اور ہتھیلیاں بھی چھپانا واجب ہوگا، قاضی عبدالوہاب کا قول شیخ احمد زروق نے ''شرح الرسالۃ'' میں نقل کیا ہے کہ یہ بہتر توضیح ہے، ایسا کرنا عورت پر واجب ہے (۲)، اور ''شرح الصغیر'' میں ہے کہ اجنبی یعنی نامحرم کے سامنے چہرہ اور ہتھیلیوں کے علاوہ عورت کا مکمل جسم ستر ہے، یہ دونوں عضو اگر چہ ستر نہیں ہیں، مگر خوفِ فتنہ کے وقت ان کو بھی چھپانا ضروری ہے (۳)۔

امام نووی شافعی کی ''المنہج'' میں مذکور ہے کہ آزاد عورت کا ستر چہرہ اور ہتھیلیوں کے سوا ہے، اس کتاب کے حاشیہ میں شیخ سلیمان الجمل نے لکھا ہے کہ یہ نماز کے دوران عورت کا ستر ہے، مسلمان عورتوں اور محرم مردوں کے سامنے عورت کا ستر ناف سے لے کر گھٹنے تک ہے، البتہ اجنبیوں کے روبرو پورا جسم ستر ہے، اور کافر عورتوں کے سامنے ایک قول کے مطابق پورا جسم ستر ہے، جب کہ دوسرا قول یہ ہے کہ کام کاج کرتے وقت جو اعضاء ظاہر ہوتے ہیں ان کے علاوہ سب ستر ہیں (۴)۔

شیخ زکریا انصاری نے لکھا ہے کہ آزاد عورت کا ستر چہرہ اور ہتھیلیوں کے سوا ہے، شیخ شرقاوی نے اس پر حاشیہ لگایا ہے کہ یہ ستر نماز میں ہے، نماز سے باہر اجنبیوں کی نگاہ پڑنے کے اعتبار سے اس کا ستر مکمل جسم ہے، حتی کے چہرہ اور ہتھیلیاں بھی، اگر چہ فتنہ سے محفوظ ہو (۵)۔

علماء کا دوسرا قول: عورت کے لیے چہرہ کھولنا ممنوع وحرام ہے، اس کے قائل حنابلہ اور بعض شوافع ہیں۔

شیخ یوسف بن عبدالہادی مقدسی حنبلی فرماتے ہیں کہ مرد کے لیے کسی اجنبیہ پر نگاہ ڈالنا جائز نہیں ہے، اِلا یہ کہ وہ غیر مشتہاۃ، بوڑھی یا ایسی چھوٹی بچی ہو جو محلِ شہوت نہ ہو، مرد پر عورت سے صَرفِ نظر کرنا واجب ہے، اور عورت پر باہر نکلتے وقت چہرہ چھپانا واجب ہے (۶)۔

---

(۱) ۲۷۲/۱ (۲) مواہب الجلیل: ۴۹۹/۱
(۳) شرح صغیر: ۸۹/۱ (۴) حاشیہ جمل: ۴۱/۱
(۵) تحفۃ الطلاب: ۱۷۴/۱ (۶) مغنی ذوی الافہام: ص ۱۲۰

شیخ منصور بن یونس ادریس البہوتی فرماتے ہیں کہ نماز میں آزاد عورت مکمل ستر ہے، حتی کہ اس کے ناخن اور بال بھی، کیوں کہ نبی ﷺ کا ارشاد ہے کہ ''عورت مجسم ستر ہے'' یہ روایت امام ترمذی نے نقل کر کے اسے حسن صحیح قرار دیا ہے (۱)۔

اسی طرح آپ ﷺ کا یہ ارشاد جس کو امام بخاری نے ذکر کیا ہے کہ ''مُحرم عورت نہ نقاب اوڑھے نہ دستانے پہنے''، اس کا مطلب یہ ہے کہ غیر مُحرم نقاب لگائے، پردہ کرے اور دونوں ہاتھ بھی چھپائے۔

نیز جس وقت رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''جو شخص تکبر کی وجہ سے اپنا کپڑا گھسیٹتے ہوئے چلے تو بروزِ قیامت اللہ تعالیٰ اس پر نظرِ رحمت نہیں فرمائیں گے، یہ سن کر حضرت ام سلمہ ؓ نے عرض کیا کہ عورتیں اپنے پائنچے کس طرح رکھیں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ایک بالشت لٹکالیں، انھوں نے عرض کیا کہ تب تو ان کے پاؤں نظر آتے رہیں گے، اس پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایک گز لٹکالیں''(۲)۔

اس حدیث کی وجہ سے بھی چہرہ چھپانا بدرجۂ اولیٰ ضروری ہوگا، کیوں کہ فتنے کے خوف کے سلسلے میں پاؤں کی حیثیت چہرے سے کم ہے۔

اسی طرح حضرت ام عطیہ ؓ فرماتی ہیں کہ ہمیں اللہ کے رسول ﷺ نے نمازِ عیدین کے لیے نکلنے کا حکم دیا کہ جوان لڑکیاں، حائضہ اور پردہ نشیں سب نکلیں، حائضہ عورتیں نماز سے دور رہیں اور مسلمانوں کی دعاءِ خیر میں شریک رہیں، میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہم میں سے جس کسی کے پاس پردہ کی چادر نہ ہو تو وہ کیا کرے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس کی بہن کو چاہئے کہ اسے اپنی چادر دیدے (۳)۔

بندہ کہتا ہے کہ سر اور سینے کے ساتھ چہرہ بھی چھپانے سے پردہ کامل ہوتا ہے۔

علامہ ابن کثیر ؒ سورہ احزاب کی آیت ۵۹ کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمان عورتوں کو حکم دیا ہے کہ جب وہ باہر نکلیں تو اپنے سروں کے اوپر سے اپنے چہرے ڈھانک لیں، امام محمد ابن سیرین ؒ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ چہرہ ڈھانک لیں اور آنکھیں کھلی رکھیں۔(۴)۔

---

(۱) کشف القناع: ۱/۳۰۹ (۲) بخاری و مسلم: کتاب اللباس
(۳) بخاری: کتاب الحیض (۴) تفسیر ابن کثیر

علامہ نیسا پوری رحمۃ اللہ نے تفسیر طبری کے حاشیہ ''غرائب القرآن'' میں لکھا ہے کہ ابتدائے اسلام میں جاہلیت کی عادت کے مطابق عورتیں معمولی کپڑوں میں رہتی تھیں، تو انھیں چادریں اوڑھنے اور چہرہ وسر چھپانے کا حکم دیا گیا(۱)۔

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ نے نبی کریم ﷺ کی وفات کے واقعہ میں لکھا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سنح (محلّہ کا نام) سے اپنی سواری پر آ کر مسجد کے دروازے پر اترے، پھر آ کر انتہائی رنج وغم کے ساتھ اپنی دختر نیک اختر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے گھر میں داخل ہونے کی اجازت طلب کی، اجازت ملنے پر اندر تشریف لے گئے، وہاں عالم یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ دنیا سے پردہ فرما کر بستر پر محوِ راحت تھے، اور آپ کے اردگرد عورتیں تھیں، ان عورتوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے پردہ کرتے ہوئے اپنے چہرے ڈھانپ لیے(۲)۔

متفقہ قول:

بر بنائے فساد، یا بسبب ستر، اندیشۂ فتنہ کے وقت عورت کے لیے چہرہ چھپانے کے واجب ہونے پر ائمۂ اربعہ کے اقوال متفق ہیں، علامہ کوثری رحمۃ اللہ ہمارے زمانہ میں چہرہ چھپانے کے وجوب کے قائل ہیں، اور جن ائمہ سے چہرہ اور ہتھیلیاں کھولنے کا جواز منقول ہے وہ خوفِ فتنہ سے محفوظ ہونے کی قید کے ساتھ مقید ہے(۳)، جامعہ ازہر کے استاذِ تفسیر شیخ محمد علی السایس کہتے ہیں کہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جواز کا یہ قول ان حالات کے ساتھ مخصوص ہو جن میں فتنے سے امن ہوتا ہے، اور جن اوقات میں فُسّاق راستوں اور بازاروں میں جمع رہتے ہیں ان میں عورت کو چہرہ کھول کر یا زینت ظاہر کر کے نکلنے کی اجازت نہیں ہوگی(۴)۔

میں کہتا ہوں کہ ہمیں دونوں قولوں کے دلائل پیش کرنے اور ان میں ترجیح دینے کی ضرورت نہیں، کیوں کہ یہ معلوم ہو چکا ہے کہ دونوں طرف کے قائلین اندیشۂ فتنہ کی صورت میں چہرہ چھپانے کے وجوب کے قائل ہیں، البتہ یہاں اس حدیثِ اسماء کا تذکرہ مناسب سمجھتا ہوں جس کی جانب اشارہ گزر چکا ہے اور اکثر لوگ اس کا ذکر کرتے ہیں، جس کو امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے، اور فرمایا ہے کہ یہ خالد بن دریک کی مرسل روایت ہے، انھوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا زمانہ نہیں پایا ہے، علامہ

(۱) تفسیر طبری ۳۲/۲۲ (۲) البدایہ والنہایۃ: ۲۴۳/۶
(۳) مقالات الکوثری: ۳۱۱-۳۱۲ (۴) تفسیر آیات الاحکام: ۱۶۲/۳

زیلعی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کو ذکر کر کے لکھتے ہیں کہ ابن القطان نے کہا ہے کہ خالد بن درید مجہول الحال ہیں، نیز حدیث کی سند میں سعید بن بشیر ائمۂ جرح وتعدیل کے نزدیک ضعیف ہے، یعقوب بن سفیان کہتے ہیں کہ میں نے ابومسہر سے اس کے بارے میں پوچھا تو جواب دیا کہ وہ ہماری جماعت میں سب سے اچھے حافظے کا مالک تھا، لیکن ضعیف اور منکر الحدیث ہے، حافظ ابن حبان نے کہا کہ خراب حافظے والا، فحش غلطیوں والا ہے، حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے ایسی روایات نقل کرتا ہے جس میں کوئی اس کا ساتھ نہیں دیتا، اور عمرو بن دینار رحمۃ اللہ علیہ سے ایسی احادیث روایت کرتا ہے جو ان کی مرویات میں معروف نہیں ہیں (۱)۔

حاصلِ کلام یہ کہ اس حدیث پر واقفیت ہی ممکن نہیں ہے تو اس سے استدلال کا کیا سوال ہے، واللہ اعلم (۲)

عورت کے لیے چہرہ کھولنا کب درست ہے؟:

عورت کے لیے بوقت ضرورت چہرہ کھولنے کی اجازت ہے، مثلاً:

۱- رشتۂ نکاح کے لیے: اگر مرد نے کسی عورت سے نکاح کا ارادہ کر رکھا ہے، اور ابتدائی مراحل پر اتفاقِ رائے ہو چکا ہے تو مرد وعورت کا ایک دوسرے کو دیکھنا جائز ہے، ابوالفرج مقدسی لکھتے ہیں کہ: مخطوبہ کا (جس عورت سے رشتہ طے ہو اس کا) چہرہ دیکھنے کے مباح ہونے پر کسی کا اختلاف نہیں ہے، کیوں کہ وہ ستر نہیں ہے، یہ الگ بات کہ وہ حسن کا سرچشمہ اور قابلِ دید مقام ہے، البتہ جو اعضاء عادۃً ظاہر نہیں ہوتے ان کو دیکھنے کی اجازت نہیں ہے (۳)۔

۲- معاملات کے وقت: خرید وفروخت کی ضرورت سے عورت کو چہرہ اور ہاتھ کھولنے کی اجازت ہے، اسی طرح مبیع (فروخت شدہ چیز) حوالہ کرنے کے لیے بائع (بیچنے والے) کا عورت کو دیکھنا درست ہے جب کہ فتنہ کا اندیشہ نہ ہو، ورنہ درست نہیں ہوگا۔

۳- علاج کے لیے: کسی مرض یا عیب کے علاج کے لیے عورت کو بقدر ضرورت چہرہ، ہتھیلیاں اور جسم کے دیگر اعضاء کا کھولنا جائز ہے۔

۴- قاضی کے پاس گواہی کے لیے: عورت کو گواہ بننے یا بقیہ صفحہ ۶۷ پر

(۱) حجاب المرأۃ المسلمۃ بحوالہ تہذیب التہذیب: ۱۰/۴ (۲) دیکھئے احکام المرأۃ المسلمۃ: ۱۷۷-۲۱۳
(۳) شرح کبیر علی متن المقنع: ۳۴۲/۷

ماخوذ

ایک عبرت انگیز واقعہ

مدینہ منورہ میں ایک حمام (غسل خانہ) تھا:

جس میں مردہ عورتوں کو نہلایا جاتا تھا اور تجہیز و تکفین کی جاتی تھی، ایک مرتبہ اس میں ایک فوت شدہ خاتون کو نہلانے کے لیے لایا گیا۔

غسل دیا جارہا تھا کہ ایک عورت نے اس مردہ خاتون کو بُرا بھلا کہتے ہوئے کہا کہ تو بدکار ہے اور اس کی کمر سے نیچے ایک تھپڑ مارا، بُرا بھلا کہنے والی اور مردہ عورت کو مارنے والی عورت کا ہاتھ جہاں اس نے مارا تھا مستقل چپک گیا، عورتوں نے بہت کوشش و تدبیر کی لیکن ہاتھ الگ نہیں ہوا۔

بات پورے شہر میں پھیل گئی کیونکہ معاملہ ہی عجیب تھا، ایک زندہ عورت کا ہاتھ ایک مردہ عورت سے چپکا ہوا ہے اب اس کو کس تدبیر سے الگ کیا جائے، مردہ کو دفن کرنا بھی ضروری ہے، اس کے لواحقین الگ پریشان ہوں گے، معاملہ شہر کے والی اور حاکم تک پہنچ گیا، انھوں نے فقہاء سے مشورہ کیا، بعض نے رائے دی کہ اس زندہ عورت کا ہاتھ کاٹ کر الگ کیا جائے، کچھ کی رائے یہ بنی کہ مردہ عورت کے جس حصہ سے اس زندہ خاتون کا ہاتھ چپکا ہے، اتنے حصہ کو کاٹ لیا جائے، کچھ کا کہنا تھا کہ میت کی بے عزتی نہیں کی جاسکتی، کچھ کا کہنا تھا کہ زندہ عورت کا ہاتھ کاٹنا اس کو پوری زندگی کے لیے معذور بنادے گا، شہر کا والی اور حاکم امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قدرشناس اور ان کے تقویٰ اور فہم و فراست کا قائل تھا، اس نے کہا کہ میں جب تک اس بارے میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے بات کرکے ان کی رائے نہ لوں میں کوئی فیصلہ نہیں دے سکتا۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے پورا معاملہ پیش کیا گیا، انھوں نے سن کر فرمایا نہ زندہ خاتون کا ہاتھ کاٹا جائے اور نہ مردہ عورت کے جسم کا کوئی حصہ الگ کیا جائے، میری سمجھ میں یہ بات آتی ہے کہ مردہ عورت پر اس زندہ خاتون نے جو الزام لگایا ہے، وہ اس کا بدلہ اور قصاص طلب کررہی ہے لہذا اس الزام لگانے والی عورت کو شرعی حد سے گذارا جائے۔

چنانچہ شرعی حد جو تہمت لگانے کی ہے یعنی اسی کوڑے۔

کوڑے مارنے شروع کیے گئے، ایک، دو، دس، بیس، پچاس، ساٹھ، ستر بلکہ اناسی کوڑوں

تک اس زندہ خاتون کا ہاتھ مردہ عورت کے جسم کے کمر کے نچلے حصہ سے چپکا رہا، جوں ہی آخری کوڑا مارا گیا، اس کا ہاتھ مردہ عورت کے جسم سے الگ ہوگیا۔

یقیناً اس واقعہ میں دوسروں پر بے جا تہمتیں لگانے والوں کے لیے بڑی عبرت موجود ہے......اللہ سبحانہ تعالیٰ ہم سب کو اس گناہ کے شر سے اپنی پناہ میں رحمت عطا فرمائے، آمین۔

(بحوالہ **بستان المحدثین للشاہ عبدالعزیز دهلوی رحمة الله علیه**، صفحہ ۲۵، **انوار المسالک لمحمد بن علوی المالکی الحسنی** ۲۴۴، **شرح التجرید الصحیح للعلا**)

(بشکریہ ماہنامہ ندائے صالحین)

☆☆☆☆☆☆☆☆

☆☆☆☆☆☆

صفحہ ۷۴ کا بقیہ

گواہی دینے کے لیے چہرہ کھولنے کی اجازت ہے، اسی طرح حقوق کو ضیاع سے بچانے کے لیے پہچان کی خاطر قاضی کے لیے عورت کا چہرہ دیکھنا درست ہے، یہی حکم پاسپورٹ وغیرہ امور کا بھی ہے۔

۵- فیصلہ کے لیے: عورت کو قاضی کے روبرو چہرہ کھولنا درست ہے، تاکہ وہ اس کے موافق یا مخالف فیصلہ کرے، نیز حقوق کو ضیاع سے بچانے کے لیے قاضی عورت کو دیکھ سکتا ہے۔

۶- تعلیم کے مقصد سے: عورت کو ایسے شخص کے سامنے چہرہ کھولنے کی اجازت ہے جو اسے ضروری علم سکھا رہا ہو، بشرطیکہ ایسا کرنا فتنہ کا باعث نہ ہو، خواہ اس علم کا تعلق دینی امور سے ہو یا ایسے دنیوی کاموں سے جن کی، عورت کو زندگی میں ضرورت ہوتی ہے۔

۷- شہوت سے محفوظ چھوٹے بچے کے سامنے: جسے عورتوں کی کچھ خبر نہ ہو۔

۸- احرام کی حالت میں: البتہ مردوں سے قربت کے وقت چہرہ پر کچھ لٹکا لینا چاہئے۔

۹- ایسی بوڑھی عورت کے لیے جو مشتہاۃ نہ ہو: نہ اسے دیکھ کر شہوت ابھرتی ہو، یعنی بڑی بوڑھی عورتوں کے لیے (۱)۔

(۱) دیکھیے حجاب المرأۃ المسلمۃ: ص ۲۳۹ اور اس کے بعد

وفیات

مسعود احمد الاعظمی

حضرت مولانا ریاست علی بجنوری صاحب

بڑے حسرت وافسوس کی بات ہے کہ پرانے لوگ اور بڑی بڑی علمی ہستیاں اور برگزیدہ شخصیتیں ایک ایک کر کے بڑی تیزی سے دنیا سے رخصت ہوتی چلی جارہی ہیں، اوراس سے زیادہ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ ان کی وفات سے علم وعمل کی دنیا میں جو خلا واقع ہوتا ہے، وہ پُر ہوتا ہوا کم دکھائی دیتا ہے، ہندوستان کی بڑی بڑی مایہ ناز اور فخر روزگار ہستیوں میں سے بیشتر تو اکیسویں صدی کی آمد سے پہلے ہی اس دار فانی سے کوچ کر گئیں، درس وتدریس، تعلیم وتربیت اور فرادسازی کے شعبوں سے وابستہ نمایاں شخصیتوں کی رحلت سے بھی اب ہندوستان کے علمی اور تعلیمی وتدریسی حلقوں میں غیر معمولی اور تشویشناک خلا پیدا ہوتا جارہا ہے۔ گزشتہ چند برسوں کا اگر جائزہ لیں تو رحلت پذیر اہل علم وکمال کی ایک طویل فہرست قارئین کو نظر آئے گی۔

گزشتہ چند مہینوں میں مسند درس وتدریس کو خالی اور سونی چھوڑ کر سفر آخرت اختیار کرنے والوں میں اہم اور نمایاں شخصیت دارالعلوم دیوبند کے مؤقر استاد اور سابق ناظم تعلیمات حضرت مولانا ریاست علی بجنوری رحمۃ اللہ علیہ کی ہے، جن کا سانحۂ ارتحال ۲۳؍شعبان ۱۴۳۸ھ مطابق ۲۰؍مئی ۲۰۱۷ء بروز شنبہ بوقت صبح پیش آیا۔

مولانا مرحوم کی شخصیت جامع کمالات تھی، وہ ایک بلند پایہ عالم، کہنہ مشق مدرس، تجربہ کار مربی ومعلم، زاہد ومتقی ہونے کے ساتھ ساتھ سیرت وکردار کے اعتبار سے بھی نمایاں مقام کے حامل تھے، اپنے تلامذہ اور شاگردوں کے علاوہ عام طلبہ پر بھی وہ نہایت شفیق اور مہربان تھے۔ دارالعلوم سے ان کی محبت عشق کی طرح تھی، ان کی شخصیت ''نرم دم گفتگو گرم دم جستجو'' کی تصویر تھی۔

مولانا کا وطن اصلی ضلع بجنور کا ایک قصبہ ''حبیب والا'' ہے، آپ کی پیدائش ۹؍مارچ ۱۹۴۰ء کو علی گڈھ میں ہوئی جہاں آپ کے والد منشی فراست علی بسلسلۂ ملازمت مقیم تھے، ابھی آپ کی عمر پانچ سال کی تھی کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا، ایک تو کم سنی دوسرے کرب یتیمی اور غربت! زندگی کا

سفر طے کرنا ایسی حالت میں آسان نہیں تھا، ایسی کیفیت میں آدمی مایوسی کے غار میں ڈوب جاتا ہے، مولانا مرحوم کے لیے بھی یہ ایک انتہائی مشکل اور مایوس کن وقت رہا ہوگا، ان حالات میں آپ کے پھوپھا مولانا سلطان الحق علیہ الرحمہ نے - جو دارالعلوم دیوبند کے سابق ناظم کتب خانہ تھے- آپ کی دست گیری اور کفالت کی، اور پوری ذمہ داری اور دلچسپی کے ساتھ آپ کی تعلیم وتربیت کا حق ادا کیا، اور بعد میں اپنی صاحبزادی کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں ان کو منسلک کر دیا۔

مولانا کی تعلیم بیشتر دارالعلوم میں ہوئی، اور وہیں سے ۱۹۵۸ء میں اس وقت کے شیخ الحدیث حضرت مولانا فخر الدین صاحب سے بخاری پڑھ کر فراغت پائی، مولانا فخر الدین صاحب کے وہ عزیز شاگردوں میں تھے، اور مولانا خود اپنے استاذ گرامی کا تذکرہ نہایت عقیدت مندانہ انداز میں کرتے تھے، جس سے استاذ کے ساتھ ان کے عمیق قلبی تعلق وارادت کا اندازہ ہوتا تھا۔

عسرت وتنگدستی مولانا کے دامن سے وابستہ تھی، معاش کے لیے انھوں نے فراغت کے بعد مختلف مشاغل اختیار کیے، جن میں الجمعیۃ پریس کی ملازمت بھی تھی۔ کئی سال بعد ۱۹۷۲ء میں دارالعلوم دیوبند میں ابتدائی عربی درجات کے مدرس کی حیثیت سے ان کا تقرر عمل میں آیا، جہاں وہ اپنی انتھک جد وجہد، مسلسل محنت وجانفشانی اور اخلاص ووفاداری کی وجہ سے ترقی کرتے کرتے نہایت اونچے مقام پر پہنچے، اور آپ کا شمار وہاں کے اعلی درجہ کے اساتذہ میں ہونے لگا۔

درس وتدریس کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف سے بھی ان کو لگاؤ تھا، کچھ عرصہ کے لیے انھوں نے رسالہ ''دارالعلوم'' کی ادارت بھی سنبھالی۔ ان کی تصنیف ''شوریٰ کی شرعی حیثیت'' اہل علم میں بہت مقبول ہوئی۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنے استاد حضرت مولانا فخر الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے صحیح بخاری کے درسی افادات کو قلم بند کر کے مرتب اور شائع کیا۔

علم وعمل کے ساتھ قوت فکر اور اصابت رائے میں بھی وہ مشہور تھے، دارالعلوم کے اہم فیصلوں اور نازک موقعوں پر وہ شریک مشورہ رہتے اور ان کی رائے اور مشورے کو بڑی اہمیت اور قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

مولانا مرحوم ایک قادر الکلام اور کہنہ مشق شاعر بھی تھے، اور ظفر تخلص کرتے تھے، تقریباً ہر صنف سخن پر انھوں نے اپنی قادر الکلامی کے جوہر دکھائے ہیں، ان کا تخلیقی شاہکار دارالعلوم دیوبند کا وہ ترانہ ہے، جس میں انھوں نے دارالعلوم کی اساس، اس کی تاریخ، اس کی روح اور مسلک ومشرب کا عطر کشید کر کے پیش کر دیا ہے۔

راقم الحروف پر بھی حضرۃ الاستاد کی شفقت اور نظر عنایت تھی، احقر کی عربی کی بیشتر تعلیم مرقاۃ

العلوم مئو میں ہوئی ہے، اور حضرت محدث الاعظمی ؒ کی خدمت میں بخاری شریف پڑھنے کا شرف حاصل ہوا ہے، فراغت کے بعد دیو بند جانے کا شوق دامنگیر ہوا۔ اپنی خواہش کا اظہار حضرت محدث الاعظمی ؒ سے کیا، تو انھوں نے نہ صرف اجازت مرحمت فرمائی بلکہ رخصت ہوتے وقت حضرت مولانا ریاست علی صاحب کے نام چند سطر کی ایک تحریر لکھ کر عنایت فرمائی، جس کا مضمون غالبًا یہ تھا کہ ''یہ لڑکا میرا نواسہ ہے، میں نے اس کو بخاری پڑھائی ہے، میں اس کے لیے داخلہ کی سفارش تو نہیں کرتا، لیکن داخلہ کے بعد اگر کوئی سہولت ہو سکے تو کر دی جائے''۔ اسی مضمون کی تحریر تھی، احقر نے جب وہ خط مولانا ریاست علی صاحب کو لے جا کر دیا تو پہلے تو بہت حیرت کا اظہار کیا کہ حضرت والا کبھی کسی کے لیے سفارش نہیں کرتے، اس لیے اس سفارش پر تعجب ہے، احقر کا داخلہ اور دیگر تمام ضروری کارروائیاں الحمد للہ بغیر کسی سفارش کے مکمل ہوگئی تھیں، لیکن اس چند سطری تحریر کا اثر تھا کہ مولانا مرحوم کی اس کے بعد ہمیشہ شفقت وعنایت مبذول رہی۔ اور تعلیم مکمل ہونے کے بعد بھی جب کبھی ملاقات ہوتی تو اس خط کو یاد کر کے اس کا تذکرہ ضرور کرتے۔ چند سال پہلے مئو کے مدرسہ تعلیم الدین میں حضرت مولانا نعمت اللہ صاحب دامت برکاتہم کے ساتھ ختم بخاری شریف کے موقع پر تشریف لائے، تو باوجودیکہ مولانا مرحوم کا تمام پروگرام پہلے سے طے تھا، لیکن احقر کی درخواست پر غریب خانہ تشریف لا کر ذرہ نوازی کا ثبوت دیا۔

اللہ تعالیٰ مولانا کی مغفرت فرمائے، ان کی علمی ودینی خدمات کو قبول فرمائے، درجات کو بلند فرمائے اور ان کی قبر کو جنت کا باغ بنائے، اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عنایت فرمائے۔

....

ممانی مرحومہ

۹ر شعبان مطابق ۶ر مئی بوقت نیم شب احقر کی بڑی ممانی اور سرپرست المآثر حضرت مولانا رشید احمد الاعظمی دامت برکاتہم کی اہلیہ طویل علالت کے بعد اس دار فانی سے کوچ کر گئیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت محدث الاعظمی ؒ کے ابتدائی شاگردوں میں ایک مولانا بشیر اللہ صاحب مرحوم تھے، ان کی کئی صاحبزادیوں میں سے ایک ممانی مرحومہ تھیں، اور سب سے چھوٹی صاحبزادی حضرت مولانا سعید الرحمٰن الاعظمی زید مجدہ مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ وایڈیٹر ''البعث الاسلامی'' کی زوجیت میں ہیں۔

مرحومہ بہت ہی نیک، عبادت گزار اور ملنسار تھیں، کم گو اور خاموش طبع تھیں، گھر کے چھوٹے

بڑے اور ہر ایک کے علاوہ اہل قرابت اور رشتہ داروں کی ہمیشہ خبر گیری کرتی رہتیں، اور آنے جانے اور ملنے والوں کا خیال رکھتی تھیں۔ طبیعت میں سادگی، شرافت اور سنجیدگی تھی، احکام شریعت کی پوری طرح پابند تھیں، اور اسی پابندی کے ساتھ زندگی بسر کی۔

کئی برسوں سے مختلف بیماریوں سے نبرد آزما رہیں، کئی سال پہلے فالج کا حملہ ہوا، بروقت علاج سے بیماری میں افاقہ تو ہو گیا تھا، لیکن اس کا اثر آخر عمر تک زائل نہیں ہوا، گزشتہ چند مہینوں میں کئی بار موت وزیست کی کشمکش میں مبتلا رہیں، پھر حالت میں کچھ سدھار ہو جاتا، لیکن رفتہ رفتہ آب ودانہ وغیرہ سب بند ہو گیا، اور اس طویل علالت کے بعد جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔

دوسرے دن دس بجے دن میں مولانا سعید الرحمٰن الاعظمی کی امامت میں ایک جم غفیر نے نماز جنازہ ادا کی، اور لب دریا واقع قبرستان میں تدفین ہوئی۔ پسماندگان میں ۷؍ صاحبزادے اور ۳؍ صاحبزادیاں ہیں، جو سب کے سب ماشاء اللہ بقید حیات ہیں، انتقال کے وقت بڑے صاحبزادے مولانا ارشد اعظمی صاحب مقیم مدینہ منورہ، اور مولانا ازہر اعظمی صاحب مقیم شارجہ موجود نہیں تھے، باقی سب موجود تھے، اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ مرحومہ کی مغفرت فرمائے، ان کی قبر کو جنت کا باغ بنائے، اور ان کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے، اور تمام پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

....

اہلیہ حاجی انوار الحق صاحب

حضرت محدث الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے وابستگان میں مئو کے محلّہ مغل پورہ کے حافظ ظہور الحق صاحب تھے جو حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے بہت گہرا اور عقیدت مندانہ تعلق رکھتے تھے، ان کے صاحبزادے حاجی انوار الحق صاحب کی اہلیہ بھی ممانی مرحومہ کے دو دن کے بعد ۸؍ مئی بروز اتوار عشاء کی نماز سے کچھ پہلے انتقال کر گئیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ان کے اوپر انتقال سے دو دن پہلے برین ہیمرج کا حملہ ہوا تھا، یہاں ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تو ان کو لکھنؤ لے جایا گیا، لیکن راستے ہی میں ان کی روح پرواز کر گئی۔

مرحومہ بہت سیدھی سادی، نیک اور صوم وصلوٰۃ کی پابند خاتون تھیں، ملنسار اور غم گسار تھیں، رشتہ داروں سے خوش دلی اور خندہ پیشانی سے پیش آتی تھیں، اللہ سے دعا ہے کہ ان کی مغفرت فرمائے، جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے، اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین۔